وعظ

قطع التمنیٰ
(احکام الٰہی میں رائے زنی سے احتراز)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لآ الٰہ الا اللّٰہ وَحْدَہٗ لاَ شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ انَّ سیدنا ومولانا محمداً عبدہ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہ تعالیٰ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ واصحابہ و بارک وسلم اما بعد: فقد قال اللّٰہ تبارک وتعالیٰ: ﴿عسی ان تکرھوا شیئًا فھو خیر لکم وعسی ان تحبوا شیئًا وھو شرلکم واللّٰہ یعلم وانتم لاتعلمون﴾(۱)

''یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر (۲) کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی ہو اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم پورا پورا نہیں جانتے''۔

تمہید

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایک مضمون جس کے حاضر رکھنے کی ہم کو ہر وقت ضرورت ہے، ارشاد فرمایا ہے۔ اور ایک بڑی غلطی کو جس

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت ۲۱۶　(۲) کسی کام کو۔

میں ہم سخت مبتلا ہیں، رفع فرمایا ہے اور اس غلطی میں اکثر اہل علم اور عوام، بڑوں اور چھوٹوں سبھی کو ابتلا ہے بلکہ اس کے غلطی ہونے کی طرف بھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ ہم لوگوں کی فہرست اعمال میں بڑی باتیں تو شمار ہوتی ہیں مگر جن میں ذرا بھی غموض (۱) ہوتا ہے ان کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ قرآن مجید میں تدبر (۲) نہ کرنا ہے اور مسلمانوں میں ایک یہ بھی کمی ہے کہ وہ قرآن مجید کے اندر تدبر نہیں کرتے۔

فوائدِ آخرت کی ناقدری

چنانچہ ہم میں دو قسم کے لوگ ہیں عوام الناس اور خواص۔ سو عوام الناس تو ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ ہی کو پڑھتے ہیں اور گو یہ بھی بے کار نہیں بلکہ ایک درجہ میں یہ بھی مطلوب ہے اور جو لوگ بدون فہم معانی (۳) تلاوت کرنے کو بے کار اور بے فائدہ قرار دیتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے۔ ہم ان سے فائدہ کی شرح پوچھیں گے اگر وہ کہیں کہ فائدہ اس کا فہمِ معانی (۴) ہے تو ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے پاس اس امر (۵) کی کیا دلیل ہے کہ فائدہ اسی میں منحصر ہے کہ قرآن شریف کو سمجھیں، بلکہ جس طرح یہ ایک فائدہ ہے ایسا ہی ثواب بھی ایک فائدہ ہے، مگر ثواب کو آج کل لوگ بہت ہی بے وقعتی سے زبان پر لاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اگر کسی کی ہزار روپے کی تنخواہ ہو یا اس کی توقع ہو جو ثواب کے مقابلے میں محض ہیچ (۶) ہے تو اس پر کیسا فخر کیا جاتا ہے اور ثواب کو جو کہ ہزار درجہ افضل ہے اس بے وقعتی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ خبر بھی ہے کہ تنخواہ کی کیا حقیقت ہے؟ تنخواہ کی حقیقت ہے کام کا عوض، بس یہی حقیقت ثواب کی

---

(۱) ذرا بھی پوشیدگی (۲) قرآن کے مضامین میں غور و فکر نہ کرنا ہے (۳) بغیر معنی سمجھے (۴) معانی کا سمجھنا ہے (۵) اس بات کی کیا دلیل ہے؟ (۶) بمقابلہ ثواب اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

ہے، پھر افسوس ہے کہ دنیا کا فانی عوض جو صدہا کدورات (۱) کے ساتھ ہے اور جس میں ترقی کے بعد تنزل (۲) بھی ہو جاتا ہے چنانچہ پنشن میں ظاہر ہے اور پھر انقطاع (۳) ہو جاتا ہے چنانچہ موت میں ظاہر ہے اس کو تو مایۂ فخر (۴) سمجھا جائے اور خدا کے گھر کی تنخواہ جس میں سدا تزاید (۵) اور پھر خلود۔ اس کو حقیر سمجھا جائے ''ما قدر اللہ حق قدرہ'' (۶) (انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہ کی جیسی کہ قدر کرنی چاہیے تھی) کہ خدا کے نام کی لگی ہوئی چیز کو ایسا حقیر سمجھا جائے۔

غرض خدا تعالیٰ کے ہاں کی تنخواہ کو ثواب کہا جاتا ہے مگر اس وقت ایسی حالت بگڑ گئی ہے کہ لوگ اس معاوضۂ آخرت کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ میں بریلی ایک مرتبہ گیا تو صاحب جنٹ نے ملاقات کی رغبت ظاہر کی میں ان سے ملا۔ اول سوال انہوں نے یہ کیا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے کوئی تفسیر لکھی ہے؟ میں نے کہا ہاں لکھی ہے۔ پوچھا کہ اس میں کتنا روپیہ ملا؟ میں نے کہا کہ ایک بھی نہیں۔ کہا کہ پھر آپ نے اتنا محنت کیوں کیا؟ میں نے کہا کہ ثوابِ آخرت کی نیت سے۔ کہنے لگا کیا ابھی مسلمانوں میں ایسے خیال کے لوگ موجود ہیں؟ میں نے کہا کہ بہت کثرت سے۔

ناتمام شاگردی

اس حکایت کے نقل کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ میں اس متاع (۷) دنیا کے مقصود سمجھنے کی جڑ بتلا دوں کہ یہ خیال مسلمانوں میں غیر مسلم قوموں سے آیا ہے اور یہ لوگ اہل یورپ کی شاگردی کرتے ہیں لیکن شاگردی بھی ناتمام ہے کیونکہ وہ لوگ تو مادہ پرست

---

(۱) دنیا میں اپنے کام کا ایسا عوض جس میں بہت سی ناپسندیدہ باتیں شامل ہیں اور وہ ختم ہونے والا ہے (۲) جس میں کبھی کمی بھی ہو جاتی ہے جیسے پینشن (۳) اور کبھی بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے (۴) باعث فخر سمجھا جائے (۵) اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے ہے (۶) الانعام:۹۱
(۷) دنیاوی فوائد۔

ہیں صانعِ عالم (۱) کے بھی قائل نہیں تو جو شخص نہ مبدء کا قائل ہو نہ معاد کا وہ تو اس خیال میں معذور ہے، اگر چہ اس میں وہ بھی معذور نہیں کہ مبدء ومعاد کا باوجود قیامِ دلائل (۲) کے انکار کیا مگر بعد انکار کے اس انکار کی فرع کا قائل ہونا یعنی دنیا کو مقصود بالذات سمجھنا زیادہ عجیب نہیں، مگر مسلمان پر کیا آفت نازل ہوئی کہ باوجود قیامت کے قائل ہونے کے پھر بھی اگر کسی کام میں دنیا کا فائدہ یا دنیا میں فائدہ نہ ہو تو اس کو بے کار سمجھے اس لئے شاگردی بھی ناتمام شاگردی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "لاالیٰ ھؤلآء ولا الی ھؤلآء" (۳) (نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے)

احتیاج کا اظہار

اب سمجھئے کہ فائدہ صرف نفع عاجل (۴) ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ نفع عاجل کے ساتھ ہی ایک نفع آجل (۵) بھی ہے یعنی اجر وثواب اور حقیقت اس کی رضا وجنت ہے، مگر اس وقت لوگ جنت کو بھی بہت ذلت سے ذکر کرتے ہیں اور دنیا پرستوں سے تو یہ امر زیادہ عجیب نہیں، غضب تو یہ ہے کہ بعضے صوفی مشرب بھی اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے پاس آئے کہنے لگے کہ ہمیں کیا ضرورت ہے جنت کی اور کیا پروا ہے دوزخ کی۔ میں نے کہا کہ ہوش کی دارو (٦) کرو۔ تم کو دس روپے سے تو استغناء ہوا نہیں جنت سے تو تم ضرور ہی مستغنی (۷) ہو گے۔ وجہ اس تمام ترکبواس کی یہ ہے کہ جنت کو ابھی دیکھا نہیں ہے جب دیکھو گے تو ہائے ہائے کر کے مر جاؤ گے۔ سمجھ لو! جنت تو بڑی چیز ہے انسان اپنی معمولی ضرورتوں سے تو مستغنی ہو ہی

---

(۱) دنیا بنانے والے خدا کے بھی قائل نہیں (۲) ابتداء وانتہاء کے دلائل ہونے کے باوجود اس نے اس کا انکار کیا اس میں وہ معذور نہیں ہے (۳) سورۃ النساء: ۱۴۳ (۴) فوری نفع ہی پر موقوف نہیں (۵) دنیا میں نفع کے ساتھ آخرت میں بھی ایک نفع ہے جو اللہ کی خوشنودی اور جنت کا حصول ہے (٦) ہوش کی دوا کرو (۷) بے نیاز۔

نہیں سکتا۔ یہاں سے حضور ﷺ کی حقیقت شناسی میں غور کرنا چاہیے کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانا کھا کر یہ دعا فرماتے ہیں کہ ”الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین غیر مودع ولا مستغنی عنہ ربنا“ یعنی اس کھانے کو نہ ہم رخصت کرتے ہیں اور نہ ہم اس سے مستغنی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص افضل تو کیا کوئی برابر بھی نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سب سے زیادہ مقبول اور کھانا پینا بظاہر بہت ہی سرسری چیز مگر باوجود اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہمیں اس سے استغناء(۱) نہیں کیونکہ جب تک زندہ ہیں دونوں وقت اس کے محتاج ہیں۔ تو اس حدیث شریف سے پتہ چلا کہ بندہ کسی وقت بھی مستغنی نہیں ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مجھے صحت کی ضرورت نہیں یا بیوی کی ضرورت نہیں ہے یا کھانے کی ضرورت نہیں اور عجب نہیں کہ اسی وجہ سے دوا کو مسنون کیا گیا ہو یعنی اگر دوا نہ بھی کی جائے تب بھی مرض کی مدافعت ہو سکتی ہے، چنانچہ ایسے بہت لوگ دیکھنے میں آئے ہیں کہ وہ دوا بالکل نہیں کرتے اور ان کو بھی شفا ہوتی ہے مگر باوجود اس کے پھر بھی جو دوا کو مسنون کیا گیا تو شاید اس میں یہی مصلحت ہو کہ اس سے افتقار(۲) کا اظہار ہو۔ اور اسی کی بنا پر بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ وہ بھوک میں رونے لگتے، کسی نے کہا کیا بچے ہو؟ کہ بھوک میں روتے ہو فرمایا تم کیا جانو؟ مجھ کو بھوکا اسی لئے کیا ہے کہ میرا رونا دیکھیں۔ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار تھے ایک شخص نے کہا کہ کیسی طبیعت ہے فرمایا کہ اچھی نہیں اس نے کہا کہ آپ ایسا فرماتے ہیں؟ فرمایا کہ سبحان اللہ! خدا تعالیٰ تو مجھے بیمار کریں کہ میرا عجز(۳) ظاہر ہو اور میں اپنی بہادری ظاہر کروں جب خدا نے بیمار کیا ہے تو کیوں نہ ظاہر

(۱) ہم اس سے بے نیاز نہیں (۲) احتیاج کا اظہار ہو (۳) کمزوری ظاہر ہو۔

کروں۔ظاہر بیں تو بہت تعجب کریں گے مگر جو حقیقت سمجھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ روح ان قصوں کی اظہارِ افتقار ہے۔اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ علماء کی جب ان حقائق پر نظر ہے اور وہ ہر چیز کو ضروری محتاج الیہ سمجھتے ہیں تو اس کا ان پر کب احتمال ہے کہ وہ معاش کو ترک کرنے کی رائے دیں جیسا کہ ان کو بدنام کیا جاتا ہے، اصل سبب اس بدنام کرنے کا یہ ہے کہ معترضین کو ان سے اختلاط (۱) کا اتفاق نہیں ہوا، ادھوری بات دور سے سن کر بدگمان ہو جاتے ہیں۔

علماء کی صحبت کا فائدہ

اس لئے ایسے لوگوں کی تشفی کا ایک سہل طریق تھوڑے دنوں سے سمجھ میں آیا ہے وہ یہ کہ جس شخص کو مقتدایانِ اسلام پر اعتراض ہوں وہ چالیس دن کسی مقتدا کے پاس صرف رہ لیں، خصوصیت کے ساتھ کسی شبہ کے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی خود اختلاط ہی سے انشاء اللہ تعالیٰ اس مدت میں سب شبہات حل ہو جائیں گے اور اگر کوئی کہے کہ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔تو لیجئے! میں سمجھائے دیتا ہوں، بات یہ ہے کہ جب پاس رہیگا تو وقتاً فوقتاً ان کے معاملات دیکھے گا ان سے قواعد دینیہ سنے گا اسی سے وہ شبہات خود بخود جاتے رہیں گے۔یہ تو ظاہر بینوں (۲) کے سمجھنے کی بات ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لوگ اہلِ نور ہیں ان کے قرب سے نورانیت آتی ہے۔اس نور سے حقائق منکشف (۳) ہوتے ہیں پس اس انعکاس کی وہ

---

(۱) ان سے میل جول کا اتفاق نہیں ہوا (۲) ظاہر پر نظر رکھنے والوں کے سمجھانے کیلئے ہے (۳) حقیقتیں آشکارا ہو جاتی ہیں۔

حالت ہوتی ہے "نور القمر مستفاد من نور الشمس" (چاند کا نور سورج کے نور سے حاصل ہوا ہے) تو صاحبِ نور کے پاس ظلمت نہیں رہتی یعنی جب نور آتا ہے تو ظلمت بھاگ جاتی ہے۔ غرض اہل نور کی صحبت میں یہ خاصہ ہے گو وجہ بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے بلکہ اس سے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو بدون اختلاط کے صرف ان کا دیکھنا ہی کشفِ حق کے لئے کافی ہو جاتا ہے اسی کو کہتے ہیں۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال   مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

(اے وہ ذات کہ تیری ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے، تیرے سامنے بغیر حجت ہی کے ہر مشکل حل ہو جاتی ہے۔)

بے قیل وقال (۱) کے معنی یہ ہیں کہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر اس درجہ کی سلامتی نہ ہو تو البتہ پھر چند روز کی صحبت کی بھی ضرورت ہے بشرطیکہ جب کہ خَتَمَ اللہ (۲) کی نوبت نہ آ گئی ہو اور بحمد اللہ کسی مسلمان کی یہ حالت ہوتی بھی نہیں ورنہ وہ مسلمان ہی کیوں ہوتا۔ غرض میں نے معترضین کے ایسے شبہات کا یہ عملی جواب تجویز کیا ہے یعنی اختلاط مع العلماء، کیونکہ محض لسانی جواب سے اگر سکوت (۳) ہو جائے مگر شفا نہیں ہوتی۔ لیکن اس عملی جواب میں اتنی شرط ضرور ہے کہ نظرِ انکار (۴) کے ساتھ وہاں نہ رہے، گو اعتقاد بھی نہ ہو بلکہ صرف یہ احتمال کافی ہے کہ شاید صحیح ہو۔ اس کے بعد انصاف کے ساتھ غور سے کام لے، میں وعدہ بلکہ خدا کے فضل پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرتا ہوں کہ کوئی بھی مرض اس قسم کا نہ رہے گا۔

---

(۱) بغیر کہے سنے (۲) جبکہ یعنی اللہ نے اس کے دل پر مہر ہی نہ لگا دی ہو (۳) زبانی جواب سے اگرچہ آدمی خاموش ہو جائے لیکن تسلی نہیں ہوتی (۴) معترض بن کر وہاں نہ رہے۔

تلاوتِ قرآن کا فائدہ

مگر آج کل لوگوں نے ہر چیز کا ست (۱) نکالنا شروع کر دیا ہے، تو علماء کی تعلیم کا بھی جو کہ ترکِ معاصی کے متعلق ہے ست نکالا ہے کہ یہ دنیا کو چھڑاتے ہیں اور محض غلط ست نکالا، ظاہر ہے کہ حاجت ایک ایسی چیز ہے کہ کسی وقت بھی اس سے استغناء کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ پس علماء جو کہ اس بات کا احساس کرتے ہیں کیا بچے ہیں کہ وہ حاجت کی چیزوں کے چھوڑنے کو کہیں گے؟ البتہ اتنا اور کہتے ہیں کہ جب دنیا سے استغناء نہیں تو آخرت سے استغناء کیوں کر کیا جاتا ہے۔ غرض علماء پر یہ الزام کسی طرح صحیح نہیں، لیکن اہل دنیا پر یہ الزام ہے کہ جنت اور ثوابِ آخرت سے چھڑاتے ہیں جیسا ان کے حال اور قال (۲) سے ظاہر ہے کہ اس کی وقعت ان کے قلب (۳) میں نہ خود ہے اور اوروں کے دل میں پیدا ہونے دیتے ہیں۔ چنانچہ جس عمل میں کوئی عاجل نفع نہ ہو محض ثواب ہی ہو کہتے ہیں کہ اس میں کیا فائدہ ہے! جس کے جواب میں تنخواہ کی مثال لایا ہوں کہ جس عمل پر تنخواہ ملے اس کو تو مفید سمجھتے ہیں تو بس ثواب بھی ایسی تنخواہ کا نام ہے جو ابد سے ابدالآباد (۴) تک بڑھے گی۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ الفاظِ قرآن شریف کی تعلیم میں کوئی فائدہ نہیں اور قرآن شریف کی تعلیم میں گو اور بھی منافع ہیں مگر اس وقت ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں صرف ایک فائدہ یعنی ثواب بیان کر دیا ہے اگرچہ وہ دوسرے فوائد بھی واجب الرعایت ہیں لیکن ایک بتلا دینا بھی کافی ہے۔

قرآن کے معانی میں غور کی ضرورت

غرض ثواب کے مطلوب ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن صرف اس پر اکتفا

(۱) جوہر (۲) جیسا کہ ان کی حالت اور باتوں سے ظاہر ہے (۳) دل میں (۴) آج سے لے کر ہمیشہ ہمیشہ بڑھتی رہے گی۔

بھی نہ کرنا چاہیے جیسا عوام نے اختیار کیا ہے بلکہ تدبر (۱) کا بھی اہتمام چاہیے کیونکہ اس ثواب کی تکمیل بھی جب ہی ہوتی ہے کہ اس پر عمل ہو اور عمل موقوف ہے سمجھنے پر بواسطہ یا بلاواسطہ، اس لئے میں شکایت کرتا ہوں کہ اس وقت عوام الناس اور علماء سب میں اس باب میں تفریط (۲) ہے کہ عوام نے تو محض حرف پڑھ لینا کافی سمجھا اور اہل علم نے محض لغت کی تحقیق کرلی چنانچہ تحصیل تفسیر کے وقت محض الفاظ قرآن شریف کا حل ہوتا ہے باقی قرآن شریف کی جو اصل غرض تھی جو اس آیت شریف میں مذکور ہے "کتاب انزلناه اليك مبارك ليدبروا اياته وليتذكر اولوا الالباب" (۳) (یہ بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں) یعنی سمجھنا اور تدبر کرنا، کہ اصل مقصود تنزیل سے یہی ہے جس کو 'لام' سے ذکر کیا ہے کسی کو اس پر نظر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں کھلی کھلی باتیں ہیں لیکن بعض اہلِ علم کو بھی نظر نہیں آتیں۔

ایک غلطی کی اصلاح

چنانچہ اس آیت شریف میں بھی ایک ضروری مسئلہ ہے جس کی طرف التفات (۴) نہیں ہوتا اس وقت اسی کو مختصر بیان کرنا چاہتا ہوں فرماتے ہیں " عسى ان تكرهوا شيئا وهو خير لكم وعسى ان تحبّوا شيئا وهو شر لكم" (۵) (ممکن ہے تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے واسطے بہتر ہو، اسی طرح ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور وہ تمہارے واسطے مضر (۶) ہو) اور ممکن ہمارے اعتبار سے فرمایا یعنی تم اس بات کا احتمال رکھو۔ آگے فرماتے ہیں " والله

(۱) قرآن کے معانی میں غور وفکر کا بھی اہتمام چاہئے (۲) زیادتی کی ہے (۳) سورۃ ص: ۲۹ (۴) توجہ نہیں ہے (۵) سورۃ البقرۃ: ۲۱۶ (۶) نقصان دہ ہو۔

یعلم وانتم لاتعلمون" (۱) کہ اللہ تعالیٰ کو (ہر خیر وشر) کا علم ہے اور تم نہیں جانتے۔ اس ترجمے کے سننے سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ آیت ہمارے ایک مرض کی اصلاح کر رہی ہے جس کو ہم بہت ہی ہلکا سمجھتے ہیں یعنی تمنّی۔ ہماری نظر تو اس طرف جاتی نہیں لیکن آیت بتلا رہی ہے کہ ہم جو یہ کہا کرتے ہیں کہ یوں نہ ہوتا تو اچھا ہوتا اور یوں ہوتا تو اچھا ہوتا یہ سب ناپسندیدہ بات ہے اور یہاں سے غلطی کو ظاہر فرمارہے ہیں کہ تم کو کیا خبر ممکن ہے کہ جس کو تم نے مضر (۲) سمجھا ہے وہ واقع میں تمہارے لئے نافع (۳) ہو اور جس کو تم نے نافع سمجھا ہے وہ واقع میں مضر ہو۔ یہ تو محض احتمال عقلی کے طور پر فرمایا تھا آگے فرماتے ہیں" واللہ یعلم وانتم لاتعلمون" یعنی شاید کسی کو یہ احتمال ہوتا کہ ممکن ہے وہی نافع ہو، اس لئے فرماتے ہیں کہ اللہ جانتا ہے یعنی جو شخص خدا کا قائل ہوگا وہ صفتِ علم کا بھی قائل ہوگا اور کمال اس کا یہ ہے کہ کوئی اس کے برابر علم میں نہ ہو۔ تو اپنے علم کے اثبات سے استدلال کرتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے جو کہ واقعی نفع وضرر (۴) کو جانتے ہیں اس کو واقع فرمایا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ وہ حکیم بھی ہیں تو ان کا واقع کرنا دلیل اس کی ہے کہ یہی بہتر تھا تو دوسرا احتمال بالکل قطع ہوگیا اور معلوم ہوا کہ تمہاری رائے غلط ہے اگر اس میں مصلحت ہوتی تو خدا تعالیٰ اسی کو واقع فرماتے۔ غرض اس آیت شریف کے ترجمے سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو ہماری ایک غلطی پر متنبہ فرمایا ہے۔

احکام کی اقسام

اب دو باتیں دیکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ آیا ہم میں یہ غلطی ہے یا نہیں،

---

(۱) سورۃ البقرۃ :۲۱۶ (۲) نقصان دہ (۳) مفید (۴) جو حقیقی نفع ونقصان کو جانتے ہیں۔

سواس کا ہم میں ہونا تو اس قدر ظاہر ہے کہ شاید کوئی قلب (۱) اس سے خالی ہو اور یہ اس قدر بڑھا ہے کہ تکوینیات سے گذر کر تشریعیات تک اس کی نوبت پہنچی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ احکام دو قسم کے ہیں۔ ایک احکام تشریعیہ جیسے نماز، روزہ کا فرض ہونا، چوری، غضب، جھوٹ، تفاخر، ریا اور بخل کا حرام ہونا۔ دوسرے احکام تکوینیہ جس کو حوادث کہتے ہیں جیسے مرنا، جینا، قحط، طاعون یا اور کوئی وبا، مال کا ضائع ہو جانا، آگ لگ جانا اور ان دونوں قسم کے امور کا صدور (۲) خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے تو ہم کو یہاں تک تمنّی کا ہیضہ ہوا ہے کہ دونوں قسموں کے متعلق تمنائیں کرتے ہیں یعنی جس طرح یہ کہتے ہیں کہ فلانا اور جیتا (۳) تو اچھا ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ روزہ فرض نہ ہوتا سود حرام نہ ہوتا تو خوب ہوتا۔ فرق اتنا ہے کہ جو علمِ دین پڑھے لکھے ہیں وہ احکام تشریعیہ میں ایسی بیباکی نہیں کرتے اور جو آزاد و بیباک ہیں وہ دونوں میں ایسی تجویزیں کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک نوجوان نے تو یہاں تک نوبت پہنچائی کہ نماز کے متعلق یہ رائے ظاہر کی اسلام میں اگر نماز نہ ہوتی تو اسلام کو خوب ترقی ہوتی کیونکہ نماز سے اکثر لوگ گھبراتے ہیں۔ نعوذ باللہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو بھی رائے دیتے ہیں لیکن اول تو آپ چیز ہی کیا ہیں دوسرے وہاں کثرتِ رائے پر کب عمل ہے۔ کیا وہاں بھی سلطنت جمہوری ہے؟

روشن خیالی کی حقیقت

میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ خود دنیا میں بھی سلطنت جمہوری کی شریعت

---

(۱) شاید ہی کوئی دل ایسا ہو جس میں یہ بات نہ ہو (۲) دونوں قسم کی باتیں اللہ کے حکم سے پیش آتی ہیں (۳) اور زندہ رہتا تو اچھا تھا۔

میں کچھ اصل نہیں، جیسا آج کل اس سیاسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ شریعت سے حکومت جمہوری کو ثابت کرنا چاہتے اور علماء سے بھی اپنے خیال کی تائید کی درخواست کرتے ہیں کہ یہ بھی ہر نئی بات کو قرآن شریف سے ثابت کر دیں اور ایسے اہل علم کو روشن خیال سمجھا جاتا ہے۔

دیوبند کے ایک تعلیم یافتہ ندوہ میں گئے تو وہاں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ روشن خیال معلوم ہوتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جس اصطلاح کے موافق آپ فرماتے ہیں میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ مجھ کو اس روشن خیالی سے بچائے۔ آج کل تو روشن خیالی کے معنی یہ ہیں کہ اس کو کفر اور اسلام دونوں متطابق (۱) نظر آئیں۔ غرض علماء سے یہ فرمائش ہوتی ہے کہ جو ہمارے منہ سے نکلتا جائے تم اس کو شریعت سے ثابت کرتے چلے جاؤ۔ تو شریعت کو اپنی ہوائے نفسانی کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔

اس پر ایک مثال یاد آئی ہے کہ ایک شخص تھا اس کی عادت تھی کہ جس مجلس میں بیٹھتا تھا لغو باتیں دور از قیاس (۲) کیا کرتا تھا لوگ اس کو بناتے۔ آخر اس نے محض اس کام کے لئے ایک نوکر رکھا کہ جو کچھ ہماری زبان سے نکلا کرے تم اس کو صحیح بنا دیا کرو۔ ایک مرتبہ کہنے لگا کہ آج ہم جنگل گئے تو ایک ہرن ملا، ہم نے جو گولی ماری تو وہ سم (۳) توڑ کر سر کو پھوڑ کر نکل گئی، لوگ سن کر ہنسنے لگے۔ خادم نے عرض کیا کہ حضور بجا ارشاد ہے وہ ہرن اس وقت کھر سے سر کھجلا رہا تھا۔ سو ہمارے روشن دماغ احباب علماء سے ایسا ہی کام لینا چاہتے ہیں، تو وہ یاد رکھیں کہ علماء کو اس نوکری کی ضرورت نہیں

(۱) کفر و اسلام دونوں ایک سے نظر آئیں (۲) ایسی بے ہودہ باتیں کرتا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آتیں (۳) اس کے پیر میں لگ کر سر میں سے ہوتی ہوئی نکل گئی۔

ہے، ایسی لغویات کو کون بناتا پھرے ان ہی میں سے ایک بحث یہ بھی ہے سلطنت کے جمہوری و شخصی ہونے کی ابھی ہم کو اس میں کلام نہیں کہ یہ مسئلہ واقع میں صحیح ہے یا غلط۔

جمہوریت کی حقیقت

لیکن گفتگو یہ ہے کہ یہ جو خیال ہے کہ جمہوری سلطنت شریعت ہی کی تعلیم ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سلطنت بھی جمہوری ہی تھی یہ کہاں تک صحیح ہے؟ سو میں کہتا ہوں کہ بالکل غلط ہے۔ یہ لوگ دلیل میں ''امرھم شوری بینھم'' (۱) ''وشاورھم فی الامر'' (۲) کو پیش کرتے ہیں، کہ دیکھئے مشورہ کا حکم ہے اور جمہوری سلطنت کی یہی حقیقت ہے کہ وہ مشورے سے ہوتی ہے۔ لیکن ان مستدلین کی وہ حالت ہے کہ ''حفظت شیئا وغابت عنك اشیاء'' (۳) کہتے تو یہ ہی کہ ہم بڑے فلسفی ہیں مگر حقیقت میں کچھ نہیں سمجھتے۔

صاحبو! جمہوری سلطنت محض مشورہ کا نام نہیں ہے بلکہ جمہوری سلطنت میں مشورے کے خاص اصول بھی ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ اگر اختلاف ہو تو کثرت رائے پر فیصلہ ہو اور بادشاہ اس کے خلاف ہرگز نہ کر سکے اور اگر بادشاہ سب کو جمع کر کے رائے لے مگر سب کے خلاف اپنی رائے پر عمل کرے تو وہ سلطنت شخصی ہوگی پس معلوم ہوا کہ محض مشورے سے سلطنت کا جمہوری ہونا لازم نہیں آتا۔

شریعت میں سلطنت شخصی معتبر ہے

اب اس کو ثابت کیا جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سلطنت میں

---

(۱) ان کے درمیان معاملات مشورے سے طے ہوتے تھے (۲) ان سے ہر کام میں مشورہ کر لیا کرو (۳) ایک بات کا خیال رکھا اور کئی باتوں سے صرف نظر ہو گیا۔

کبھی یہ بات ہوئی ہو، کوئی ایک ہی واقعہ بتلا دے کہ خلیفہ مشورہ دینے کے بعد مجبور کیا گیا ہو، واقع میں شریعت میں سلطنت شخصی ہی ثابت ہے۔ چنانچہ میں اسی آیت شریف ''وشاورھم فی الامر'' (۱) سے سلطنت شخصی کو ثابت کرتا ہوں اگرچہ بظاہر یہ آیت شریف دونوں سے ساکت معلوم ہوتی ہے تقریر اثبات (۲) یہ ہے کہ اسی سے آگے فرماتے ہیں '' فاذا عزمت فتوکل علی اللہ'' (۳) (پس جب تو ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر) یہ جملہ صاف بتلا رہا ہے کہ شریعت میں سلطنت شخصی ہے کیونکہ مشورے کے بعد ''اذا عزم اکثرھم'' یا'' اذا عزموا'' (۴) نہیں فرمایا بلکہ مدارِ کار محض آپ کے عزم پر رکھا کہ بعد مشورہ لینے کے جب آپ تنِ واحد کسی بات کا عزم (۵) فرمالیں خواہ وہ سب کے مشورے کے موافق ہو یا مخالف تو خدا پر توکل کر کے اس کو کر لیجئے۔

اب بتلایئے کہ اس آیت شریف سے سلطنت شخصی ثابت ہوئی یا جمہوری اور اس سے بھی واضح یہ مسئلہ ایک دوسری آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ''انما المؤمنون الذین امنوا باللہ ورسولہ واذا کانوا معہ علی امر جامع لم یذھبوا حتی یستأذنوہ ان الذین یستأذنونک اولٰئك الذین یؤمنون باللہ ورسولہ فاذا استأذنوك لبعض شأنھم فأذن لمن شئت منھم واستغفرلھم اللہ (۶)''۔

(مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر

---

(۱) آل عمران: ۱۵۹ (۲) اس آیت سے شخصی حکومت کا اثبات اس طریقہ پر ہوتا ہے (۳) آل عمران: ۱۵۹ (۴) ان میں سے اکثر اس بات کا پختہ ارادہ کرلیں یا وہ سب پختہ عزم کرلیں کسی بات کا (۵) بلکہ جب تن تنہا کسی رائے پر پختہ ہو جائیں (۶) سورۃ النور: آیت ۶۲۔

ایمان رکھتے ہیں اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جو بہت اہم اور جامع ہو اور اتفاقاً وہاں سے جانے کی ضرورت پڑتی ہے تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں نہیں جاتے، جو لوگ آپ سے اجازت لیتے ہیں وہی اللہ تعالیٰ پر اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔تو جب یہ لوگ ایسے موقع پر اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے آپ سے اجازت چاہیں تو ان میں سے جس کے لیے آپ چاہیں اجازت دیدیا کریں اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کیا کریں۔)

اس میں اول تو یہ حکم ہے کہ پوچھ کر جایا کریں پھر آگے فرماتے ہیں کہ جب وہ پوچھیں تو جس کو آپ چاہیں اجازت دے دیں۔ سو غور کیجئے کہ ”اذا استأذنوك“ (۱) کے بعد ”فاذن“ میں ”لمن شئت“ (۲) بھی فرماتے ہیں اور ”اذا استأذنوك“ سب کے اِذن (۳) چاہنے کو بھی مشتمل ہے تو فرض کیجئے اگر سب کے سب اِذن چاہنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اس وقت سب کا اتفاق اعطائے اِذن پر متحقق (۴) ہوگا مگر اس وقت بھی یہی حکم ہے کہ فاذن لمن شئت منهم کہ جس کو چاہو اجازت دو (اور چاہو نہ دو) دیکھئے باوجود اتفاق کے مدار کار تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہی پر رکھا۔تو بتلایئے اس سے سلطنت جمہوری ثابت ہوئی یا شخصی؟

چوتھی صدی کے بعد اجتہاد

صاحبو! انسان کو چاہیے کہ وہ جس کام کا نہ ہو اس میں دخل نہ دے نصوص (۵)

---

(۱) جب وہ آپ سے اجازت چاہیں (۲) تو آپ جس کو چاہے اجازت دیں (۳) سب کے اجازت چاہنے کو بھی شامل ہے (۴) سب اس پر متفق ہو جائیں گے کہ آپ ان کو اجازت دے دیں (۵) قرآنی احکام کو سمجھنا۔

کا سمجھنا ہر ترجمہ دیکھنے والے کا کام نہیں۔ ''نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند'' (جو شخص بھی آئینہ رکھتا ہو ضروری نہیں کہ وہ سکندری بھی جانتا ہو) ایسے لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے کہ کسی ہندو کے ہاتھ سونٹھ(۱) کی گرہ آ گئی وہ پنساری بن بیٹھا۔ ذخیرہ تو کل یہ ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ دیکھ لیا و بس اس پر جوش اجتہاد۔ پھر ترجمہ بھی ایسا نور بھرا کہ جو ترجمہ سب سے زیادہ مقبول و مشہور ہے اسکی یہ حالت ہے کہ لفظ ''نستبـــق'' (۲) کا ترجمہ کیا ہے کہ کبڈی کھیلنے لگے معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے یا تو کبھی کبڈی کھیلی نہیں یا بھول گئے ہونگے استبـــاق کبڈی کو کہتے ہی نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے دوڑنے لگے۔ سو اول تو یہ ترجمہ لغت کے خلاف، دوسرے عقل کے بھی خلاف، کیونکہ کبڈی کا میدان بہت کم ہوتا ہے اس میں کپڑوں کا محافظ پیش نظر رہتا ہے تو اس میں بھیڑیئے کے کھانے کا عذر کہاں چل سکتا ہے بخلاف استباق (۳) کے صحیح معنی کے، کہ اس میں محافظ نظر سے غائب ہو جائے گا۔

غرض اس قسم کے تو تراجم پیش نظر رکھیں اور اس پر اجتہاد کریں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اجتہاد اب منقطع ہو گیا ہے۔ اسی کو فقہاء نے بھی لکھ دیا ہے کہ بعد چوتھی صدی کے اجتہاد ختم ہو گیا اور جب علماء سے بھی اجتہاد منقطع (۴) ہو گیا تو عوام الناس میں تو کہاں محتمل ہے؟ یہ سلطنت جمہوری کا مسئلہ ایک جملہ معترضہ تھا اصلی مضمون یہ تھا کہ خدا کے ہاں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ تو اب آپ کو کیا منصب ہے کہ نماز میں رائے دیں۔ یہ تو نماز میں تھا۔

---

(۱) خشک ادرک (۲) حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو لفظ نستبـــق آ رہا ہے اس کا ترجمہ کیا ہے (۳) دوڑ لگانا (۴) ختم ہو گیا۔

احکامِ دین میں لوگوں کی رائے زنی

ایک صاحب نے روزہ میں یہ رائے دی کہ روزہ اگر فروری میں ہوتا تو اچھا ہوتا کہ آسانی ہوتی۔ حالانکہ اس عقل مند نے یہ نہ سوچا کہ روزہ صرف اس کے لیے تو نہیں کہ اس کی آسانی دیکھ لیتے، وہ تو تمام روئے زمین کے لئے ہے کیا ساری دنیا میں فروری کے مہینے میں یہی حالت رہتی ہے جو کہ یہاں رہتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے رہتے ہیں ان کو واقعات کی خبر نہیں، مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ خود کونسے گنبد میں بیٹھے رہتے ہیں کہ ان کو اتنا واقعہ معلوم نہیں کہ فروری میں مختلف اقالیم (۱) میں کیا حالت ہوتی ہے اور اگر معلوم ہے تو اور بھی زیادہ افسوس کی بات ہے کہ باوجود اطلاع کے پھر ایسی بے ہودہ رائے دیتے ہیں۔

فان کنت لاتدری فتلك مصيبة

وان كنت تدری فالمصيبة اعظم

(اگر تو نہیں جانتا تو یہ خود ایک مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ مصیبت اس سے بھی بڑھ کر ہے)

کیا خوبصورت تجویز ہے کہ صرف آپ اور آپ کے چند بھائی تو آرام میں رہیں اور ساری دنیا مصیبت میں رہے بخلاف اس حالت موجودہ کے کہ رمضان المبارک کا قمری مہینہ ہو کر ہر مقام پر اس میں کبھی سردی، کبھی گرمی، کبھی بڑا دن، کبھی چھوٹا دن، تو اس میں کبھی کسی اقلیم کی رعایت ہے اور کبھی کسی دوسری کی ہے جس سب مساوی ہو گئے تو حکمت کی بات یہ ہے یا وہ ہے۔

(۱) مختلف علاقوں میں۔

قربانی میں مقصود خون بہانا ہے

علی ہذا(۱) قربانی کے متعلق یہ رائے دی جاتی ہے کہ اس زمانے میں چونکہ روپیہ پیسہ نہیں تھا اور مواشی (۲) ان لوگوں کے پاس بکثرت ہوتے تھے اس لئے صدقہ کا یہ طریقہ مقرر کیا گیا تھا کہ ذبح کرو اور تقسیم کرو اور اب چونکہ روپیہ بکثرت موجود ہے اور نقد سے صدقہ کر سکتے ہیں اس لئے اب اس وحشی طاعت کو چھوڑ دینا چاہیئے (نعوذ باللہ) ایک صاحب لندن سے بیٹھے ہوئے اپنے دست مبارک سے یہ رائے خط میں لکھ رہے ہیں ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو یاد رکھیں کہ ''ان الظن لایغنی من الحق شیئا'' (۳) (خیالی باتیں کسی درجہ میں بھی حق کے مقابلہ میں مفید نہیں ہوسکتیں) آگے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اس رائے کے خلاف پر خود دلیل قائم ہے۔ یہ دیکھئے کہ قربانی میں طاعتِ مقصودہ اراقۃِ دم (۴) ہے یا مساکین کو کھلانا۔ سو یہ امر ثابت (۵) ہے کہ اگر کوئی شخص ذبح کر کے سارا گوشت خود کھا جائے اور ایک بوٹی بھی کسی کو نہ دے تب بھی اس کو پورا ثواب قربانی کا ملے گا اس سے صاف معلوم ہوا کہ مقصود اراقۃِ دم ہے نہ کہ کھلانا جیسا اس ذی (۶) رائے نے دعوی کیا۔ رہی یہ بات کہ ارقۃِ دم کیوں مقصود ہوا۔ سو اس کی ''لِمَ'' (۷) کی اطلاع ہم کو ہونا ضروری نہیں، نہ ہمارا دعوی ہے کہ ہم جانتے ہیں پھر یہ کہ اگر نفع ہی پہنچانا ہوتا تو زندہ بھی تو دیا جا سکتا تھا تو جس زمانے میں یہ حکم ہوا تھا اس وقت مسلم (۸) دینے کی کیوں اجازت نہ ہوئی؟ بلکہ مسلم کی قیمت تو زیادہ

(۱) اسی طرح (۲) جانور (۳) سورۃ یونس:۳۶ (۴) خون بہانا یعنی جانور ذبح کرنا ہے یا غریبوں کو کھلانا ہے (۵) چنانچہ یہ بات ثابت شدہ ہے (۶) صاحبِ رائے (۷) اس کی وجہ کیا ہے اس کا معلوم ہونا ہمارے لیے ضروری نہیں (۸) صحیح سالم جانور دینے کی کیوں اجازت نہ ہوئی۔

اٹھتی ہے پس معلوم ہوا کہ محض اراقۂ دم ہی مقصود ہے غرض اسی طرح ہر چیز کے درمیان میں کم وبیش تمنا کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ربوا کی غلط تشریح

چنانچہ سود میں بھی اول تو یہی تمنا ہوئی کہ کاش سود حلال ہوتا مگر اب اس پر قدرت نہیں رہی، اس لئے دوسری تمنا یہ ہوئی کہ کاش علماء کچھ تاویل وغیرہ کردیں چنانچہ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو خود ہی اس میں اصلاح شروع کردی۔ میں نے ایک مطبوعہ رسالے میں خود دیکھا ہے ایک صاحب نے فرمایا کہ سود حلال ہے اور یہ جو قرآن شریف میں ربوا کا حرام ہونا آیا ہے یہ لفظ رُبا بضم الرائے ہے جو ربودن سے مشتق ہے یعنی غصب اور لوٹ، یہ حرام ہے نہ کہ سود۔ اور مولویوں نے اپنی رائے سے اعراب لگادیئے۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور علماء سلف رحمہم اللہ کو کہ انہوں نے رسمِ خط کو محفوظ و باقی رکھنے کو واجب فرمایا، پس اگر یہ لفظ ربودن سے ہوتا تو رسم خط میں کیوں ہوتا، فارسی لفظ ہے اور فارسی میں بھی رُبا اس معنی مصدری میں آتا ہی نہیں۔ تو دیکھئے کہاں تک ان لوگوں کی نوبت پہنچ گئی۔

احکامِ دین اور اسلام کے بارے میں بے ہودہ آراء

اور اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں کہ احکام فرعیہ بلکہ اصولیہ میں اول ایک تمنا تغیر و تبدیل کی تجویزیں ہوتی ہیں چنانچہ ایک مرتبہ میں رُرکی میں تھا کہ میں نے سنا کہ آج یہاں چند عقلاء میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ نکاح کی رسم کو اٹھادینا چاہیے مثل دیگر متاع بازاری(۱) کے یا مثل جانوروں کے۔ جس سے جس کی موافقت ہوجائے اس

(۱) دوسری قابل فروخت چیزوں کی طرح۔

میں اجتماع رہے پھر رضامندی نہ رہے، جدا ہو کر دوسرے سے رضامند ہو جائے۔

بلکہ ایک صاحب کا تو یہاں تک مضمون اخبار میں لکھا دیکھا ہے کہ خود اسلام کی بھی ضرورت نہیں، اس اسلام وغیر اسلام کے اختلاف سے باہم جنگ وجدل ہوتا ہے اور یہ تجویز کیا کہ ساری دنیا مل کر ایک نئے مذہب کو اختیار کرے جس کا نام مذہب توحید ہو، باقی رسالت وغیرہ سو جس کا جی چاہے مانے جس کا جی چاہے نہ مانے اور ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں متحد المذہب (۱) سمجھے جائیں اللہ اکبر! کہاں تک یہ لوگ پہنچے ہیں اور اس قسم کی رائیں بوجہ خبث کے اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ان کو نقل کیا جائے، ان میں ایک قسم کی ظلمت ہے اسی واسطے میں اس میں تطویل کلام نہیں کرنا چاہتا مگر یہ بتلاتا ہوں کہ احکامِ شرعیہ میں یہ گڑبڑ لوگوں نے مچا رکھی ہے گویا در پردہ شریعت کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔

اللہ کی شان میں گستاخی

اب دوسرے احکام تکوینیہ رہ گئے اور اس وقت انہیں کا بیان کرنا زیادہ مقصود بھی تھا سو ان کے متعلق تمنا وتجویزیں کرنے میں دیندار اور دنیا دار سبھی مبتلا ہیں۔ چنانچہ میں واقعات یاد دلاتا ہوں جس سے میرے اس دعوے کی تصدیق ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص مر جائے اسوقت عموماً خدا تعالیٰ کو رائے دی جاتی ہے جس کی تعیین ابھی بتلاؤں گا لیکن چونکہ مقصودِ رائے دینا نہیں ہوتا اس لئے میں اس کو کفر نہ کہوں گا تاہم ہے بہت سخت ہونے کو یہ آیت بتلا رہی ہے ''ام تنبئونہ بما لا یعلم فی الارض'' (۲) یا کیا تم اسے اطلاع اور خبر دینے والے ہو کہ وہ زمین میں سے یہ بات نہیں جانتا) اور وہ رائے دینا یہ ہے

(۱) دونوں کو ایک مذہب کا حامل سمجھا جائے (۲) سورۃ الرعد آیت ۳۳۔

کہ جب کوئی مرجاتا تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ اگر دس برس اور زندہ رہ جاتا تو بچوں کی پال(۱) ہوجاتی، کوئی کہتا ہے ابھی کیا مرنے کی عمر تھی ایک کہتا ہے پس ماندوں کا کیا حال ہوگا؟(اللہ اکبر واللہ العظیم) اگر کبھی مخلاً بالطبع(۲) ہوکر غور کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ ان کلمات کا کس کو سنانا مقصود ہے، اگر مخلوق کو سنانا ہے تو محض بے کار ہے کیونکہ ان کے سنانے سے کیا کام چلے گا جو بات ان کے اختیار میں ہو وہ ان کو سناؤ باقی مارنا جلانا (۳) یہ تو خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔اس لئے مخلوق تو مخاطب نہیں پھر سوائے خالق کے اور کون مخاطب ہے کیوں کہ یہ سب ان کی ہی قدرت میں ہے، تو گویا یہ شخص خدا تعالیٰ کو رائے دیتا ہے کہ اس وقت کا مرنا تو کچھ نامناسب سی بات ہوئی۔اب غور کیجئے کہ اس گستاخی کا کیا درجہ ہے؟ علی ہذا بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ابھی تو اس کی عمر مرنے کی نہ تھی۔صاحبو! اگر اس کی تاویل نہ کی جائے تو دیکھئے کہ آیت قرآنی کے کس قدر خلاف ہے۔فرماتے ہیں ’’اذاجاء اجلهم لا يستاخرون ساعة ولا يستقدمون (۴) (جب ان کی موت کا وقت آجاتا ہے تو وہ ایک گھڑی کی دیر کرسکتے ہیں نہ جلدی کرسکتے ہیں) اور اگر تاویل کی جائے تو وہ تاویل یہی ہوسکتی ہے کہ اس عمر میں مرنا بے محل ہوا، تو گویا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے نامناسب کام کیا نعوذباللہ یہ وہی اعتراض ہے جو کہ شیطان نے کیا تھا اور اس کی بدولت کافر ہوا کیونکہ شیطان صرف سجدہ نہ کرنے سے کافر نہیں ہوا بلکہ اس سجدہ کو خلاف حکمت بتلانے سے جیسا اس کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے ’’أأسجد لمن خلقت طينا‘‘(۵)(کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا)

---

(۱) بچوں کی پرورش ہوجاتی (۲) خالی الذہن ہوکر سوچتا ہوں (۳) زندگی اور موت (۴) سورۃ النحل:۶۱
(۵) سورۃ الاسراء:۶۱۔

جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں ان سے افضل ہوں اور افضل کو مفضول کی اطاعت خلاف حکمت ہے۔تو یہی حاصل ہوا اس شخص کے قول، کا پس اگر یہی معنی ہیں تو یہ بعینہ وہی ہوا جو شیطان نے کہا تھا اور بعض لوگ اس سب سے بڑھ کر یہ غضب کرتے ہیں کہ ایک نے تو بعنوان بالا افسوس کا اظہار کیا دوسرے صاحب اس کی تائید میں گلفشانی کرتے ہیں کہ بھائی اللہ کی ذات بڑی بے پرواہ ہے۔ذرا سمجھ سے کام لیا جائے تو اس موقع پر بے پرواہ کہنے کے معنی بجز اس کے کیا ہو سکتے ہیں کہ وہ موقع بے موقع کو نہیں دیکھتے، غایت بے پروائی کے سبب جو چاہتے ہیں کرڈالتے ہیں، تو اس حساب سے تو خدا تعالیٰ نعوذباللہ گویا اَن نیاؤ نگر(۱) کا راجہ ہے اَن نیاؤ کے معنی بے انصافی کے ہیں، اَن حرف نفی ہے اور نیاؤ انصاف کو کہتے ہیں یعنی شہرِ ناانصافی کا حاکم

احمقوں کی بستی

ایک مرتبہ ایک گرو اور ایک چیلہ کا وہاں گذر ہوا، نیا شہر تھا، حالات دریافت کئے بھاؤ بھی مختلف اجناس کا پوچھا تو سب سولہ سیر(۲)۔گرو نے کہا یہاں ادنیٰ اعلیٰ سب برابر ہیں یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔چیلہ نے کہا خوب گھی شکر کھائیں گے، موٹے ہونگے۔غرض وہاں رہ پڑے ایک روز بطریق سیر پھرتے پھرتے راجہ کی کچہری کی طرف جا نکلے، دیکھا ایک مجمع ہے اور ایک مقدمہ پیش ہے۔مقدمہ یہ ہے کہ ایک چور ایک مہاجن(۳) پر دعوی کرتا ہے کہ میں اور میرا ایک رفیق(۴) جس کی لاش سامنے پڑی تھی اس کے گھر چوری کرنے گئے نقب(۵) دیا نقب کے اندر میرا رفیق گھستا تھا کہ دیوار

(۱) ناانصافی کی بستی کا حکمران (۲) ہر چیز ایک روپے کی سولہ سیر ملتی تھی (۳) ساہوکار (۴) میرا ساتھی (۵) دیوار توڑ کر گھر میں داخل ہونے کا راستہ بنایا۔

اوپر سے آرہی (۱) اب مجھ کو خون کا بدلہ خون ملنا چاہئے۔ راجہ صاحب نے فرمایا کیوں؟ کہا ایسی دیوار کیوں بنائی تھی؟ مہاجن نے کہا کہ یہ تو معمار (۲) کی خطا ہے۔ معمار بلایا گیا اس نے مزدور کا نام لے دیا جس نے ایسا خراب گارا دیا۔ مزدور بلایا گیا اس نے کہا سقہ (۳) نے زیادہ پانی چھوڑ دیا تھا۔ وہ بلایا گیا اس نے کہا سرکاری ہاتھی بھاگا ہوا آتا تھا ڈر کر مشک کا منہ زیادہ کھل گیا۔ فیل بان کو بلایا اس نے کہا ایک عورت پازیب (۴) پہنے سامنے سے گذری ہاتھی بھڑک گیا۔ عورت حاضر کی گئی اس نے کہا یہ سنار کی خطا ہے اس نے باجہ ڈال دیا۔ سنار بلایا گیا وہ کوئی بات نہ بنا سکا، آخر اس کے لئے پھانسی کا حکم ہوا، جب پھانسی پر چڑھانے لگے، اطلاع کی گئی کہ سنار دبلا ہے اور پھانسی کا حلقہ فراخ (۵) ہے حکم ہوا کہ اچھا کسی موٹے کو پکڑ کر پھانسی دے دو اتنے موٹے میاں چیلے (۶) ملے جنہوں نے خوب گھی شکر کھایا تھا یہ پکڑے گئے اب تو بڑے گھبرائے اور گرو (۷) سے کہا کسی طرح بچاؤ تو بہانے سے بھاگیں، گرو کو رحم آیا اور یہ ترکیب کی کہ افسرانِ فوجداری سے التجا کرنا شروع کی کہ مجھ کو پھانسی دے دو، اس پر سب کو تعجب ہوا، راجہ کو خبر پہنچائی، ان سے وجہ پوچھی تو گرو نے کہا کہ یہ ساعت (۸) ایسی ہے کہ اس میں جس کو پھانسی ہو وہ سیدھا بیکنٹھ (ہندوؤں کی جنت) میں جاوے، راجہ (۹) نے کہا تو بس مجھ کو پھانسی دے دو آخر اس راجہ سے اس طرح زمین پاک ہوئی۔

یہ ایک قصہ ہے اَن نیاؤ نگر کا، کیا ہمارے بھائی بند خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی

---

(۱) دیوار اوپر سے گر پڑی (۲) ساہوکار نے کہا یہ تو دیوار تعمیر کرنے والے کی غلطی ہے (۳) ماشکی نے (۴) پیر میں بجتا ہوا زیور پہن کر سامنے سے گذری جس سے ہاتھی بدک گیا (۵) پھانسی کا پھندا بڑا ہے (۶) شاگرد (۷) استاد (۸) یہ لمحہ ایسا ہے (۹) ہندو حکمران۔

نعوذ باللہ ایسا ہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کے کام نعوذباللہ بے محل ہوتے ہیں۔ مثلاً ابھی موقع نہ تھا اور ماردیا۔

اللہ کی بے نیازی کا مطلب

غرض یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی عظمت قلوب میں نہیں جو منہ میں آیا بک دیا صاحبو! وہ بے پروا ہے مگر اس کے بے پرواہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی اس کی عبادت نہ کرے تو اس کا کوئی ضرر (۱) نہیں اور اگر کرے تو اس کا کوئی نفع (۲) نہیں تو حاصل اس کا یہ ہوا کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور یہ معنی ہرگز نہیں کہ نعوذباللہ وہ بے رحم ہے اور مصلحت نہیں دیکھتا، بے سمجھے کر بیٹھتا ہے (نعوذباللہ منہ)

صاحبو! یہ عقیدہ نہایت گمراہی کا ہے اور دلیل اس معنی کی ہے کہ قرآن مجید میں ہے "من جاهد فانما يجاهد لنفسه ان الله لغني عن العالمين" (۳) (جو شخص کوشش کرتا ہے وہ اپنے لئے کوشش وسعی کرتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ دنیا والوں کا محتاج نہیں) اگر تم کفر کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارا محتاج نہیں دوسری جگہ فرماتے ہیں "ان تكفروا فان الله غني عنكم" (۴) (اگر ناشکری کروگے تو خدا تعالیٰ تم سے بے پرواہ ہے) تو خدا تعالیٰ نے اپنے غنی ہونے کو طاعت اور معصیت کے ساتھ ذکر فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کو نہ کسی کی طاعت کی ضرورت ہے اور نہ معصیت سے اس کو ضرر ہے کیونکہ اس کی سلطنت کسی کی اطاعت پر موقوف نہیں۔

کہ ملکش قدیمست وذاتش غنی

(اس کی سلطنت ہمیشہ سے ہے اور اس کی ذات کسی کی محتاج نہیں) اور

(۱) اس کا کوئی نقصان نہیں (۲) فائدہ (۳) سورۃ العنکبوت: ۶ (۴) سورۃ الزمر: ۷۔

ارشاد ہے "واللہ الغنّی وانتم الفقراء"(۱) (خدا تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں اور تم اس کے محتاج ہو) تو بے پرواہ کے معنی بے انتظام کے بھی ہیں اور غیر محتاج کے بھی ۔لوگوں نے ظلم کیا کہ خدا تعالیٰ کو معنی اول کے اعتبار سے بے پرواہ کہنے لگے۔جیسا کہ قرینۂ مقامِ استعمال(۲) سے معلوم ہوتا ہے۔غرض ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعات تکوینیہ میں بھی تجویزیں لگاتے ہیں اور یہ مرض سخت عام ہو گیا ہے اس سے توبہ کرنا چاہیے۔

اہل اللہ کی معمولی لغزش پر گرفت

اور ہم بے وقوفوں کے ساتھ تو ان حماقتوں پر حلم کا برتاؤ کیا جاتا ہے باقی جن کی بڑی شان ہے ان کے کلام میں تو اگر ذرا اس کا شبہ بھی ہو جائے تو ان کی گوشمالی(۳) کر دی جاتی ہے۔چنانچہ ایک مرتبہ ایک بزرگ نے کہا کہ آج کیا موقع پر بارش ہوئی ہے۔فوراً عتاب ہوا کہ او بے ادب بے موقع کب ہوئی تھی جو موقع کے ہونے میں آج کی تخصیص کرتا ہے۔سن کر تھرا گئے تو دیکھئے حالانکہ یہ مدح(۴) تھی مگر اس میں چونکہ ایک اعتراض ایہام(۵) تھا عتاب ہو گیا اگرچہ باستلزامِ بعید سہی(۶)

مقامِ ادب میں احتیاط لازم ہے

صاحبو! وہ خدا تعالیٰ ہے، کوئی برابر کا دوست نہیں۔وہ سلطان السلاطین ہے مگر خدا جانے کس نے مشہور کر دیا کہ ۔

---

(۱) سورۃ محمد: ۳۸ (۲) جس موقع محل پر اس کو استعمال کرتے ہیں وہ دلیل ہے اس بات کی کہ بے پرواہ کے معنی اول مراد ہیں (۳) ان کی پکڑ ہو جاتی ہے (۴) تعریف (۵) اس عنوان کے اختیار کرنے میں اعتراض کا شبہ پڑتا تھا اس لئے گرفت ہوئی (۶) اگرچہ یہ بات ایک احتمال کے درجہ میں لازم آتی تھی۔

باخدا دیوانہ باش وبامحمد ہوشیار

(خدا کے ساتھ دیوانے بنے رہواور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوشیار)

اگر اس کے یہی معنی ہیں جو کہ متبادر (۱) ہیں تب تو محض مہمل بات ہے اور اگر اس میں کوئی مناسب تاویل کی جائے تو خیر۔اور وہ تاویل یہ ہے کہ غلبۂ حال میں کچھ کلمات خدا کے معاملے میں نکل جائیں تو وہ معاف ہیں مگر حضور ﷺ کے ساتھ ہرگز ایسا نہ ہونا چاہیے اور اگر تاویل نہ کی جائے تو سمجھ لیا جائے کہ

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد　　　بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

(بے ادب آدمی کی برائی تنہا خود اس کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ اس کی آگ ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے)

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم کو تو کہیں بھی آگ لگی نظر نہیں آتی تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ

آتشے گر تامدت ایں دود چیست　　　جاں سیہ گشت ورواں مردود چیست

(آگ تجھ تک نہیں پہنچتی ہے تو یہ دھواں کہاں سے آگیا بدن تک سیاہ ہوگیا اور بال تک جل گئے یہ سب آخر کیوں ہے)

پس مقام ادب ہے احتیاط سخت لازم ہے۔خلاصہ یہ کہ ان قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کے کلمات کہتے ہیں واقعہ میں رائے لگاتے ہیں۔

تحقیقِ مرجعِ ضمیر

تو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں ان سب کی جڑ کاٹ دی اور لفظ شیئًا اس آیت

(۱) جو ظاہری طور پر اس سے سمجھ میں آتے ہیں۔

میں عام ہے امور تشریعیہ اور امور تکوینیہ (۱) سب کو، کیونکہ اس سے اوپر ارشاد ہے ”کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم“ (۲) (تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے اور تم اس کو ناپسند کررہے ہو) ھو کی ضمیر یا تو قتال (۳) کی طرف راجع ہے جو کہ امر تکوین ہے یا کتابتِ قتال (۴) کی طرف جو کہ امر تشریعی ہے اور ترجیح بلا مرجح سے بچنے کے لئے عام کہا جائے دونوں کو، اس طرح کہ مرجع قتال ہو باعتبار وجود تشریعی اور تکوینی کے اور بہتر یہی ہے کہ عام کہا جائے اور معنی عام کی تعلیل (۵) میں اس جملہ ”وعسی الخ“ کو کہا جائے۔

احکامِ شرعیہ میں عام مصلحت کا لحاظ

اب اس کی اور کثیر الوقوع مثالیں عرض کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ مثلاً جب تک پھل نہ آجائے، بہار (۶) کا بیچنا حرام ہے۔ بہت لوگ اس کی تمنا کرتے ہیں کہ یہ جائز ہوتا تو اچھا ہوتا کہ مصلحت حاصل ہوتی، لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ یہ ممنوع ہو چنانچہ بعض اوقات جو پھل نہیں آتا تو خریداروں کو کس قدر خسارہ اٹھانا پڑتا ہے، باقی اگر شبہ ہو کہ اس میں خریدار کی مصلحت محفوظ رہی مگر بائع (۷) کی مصلحت تو جاتی رہی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ منفعتِ عام مقدم (۸) ہوتی ہے منفعتِ خاص پر اور اسی طرح مضرتِ (۹) عام کا بمقابلہ مضرتِ خاص کے زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے چنانچہ ہر سلطنت میں اس پر نظر کی جاتی ہے۔ دیکھئے بعض مرتبہ حکام کی طرف سے امرود وغیرہ فواکہ (۱۰) کھانے کی ممانعت ہوجاتی ہے اور اس کی فروخت سے بھی روک دیا جاتا ہے حالانکہ فروخت کرنے میں بائع کی مصلحت

(۱) شرعی اور تکوینی سب احکام کو شامل ہے (۲) سورۃ البقرہ:۲۱۶ (۳) ھو کی ضمیر یا جہاد کی طرف راجع ہے (۴) یا فرضیت جہاد کی طرف (۵) اور اس کی علت لفظ عسی کو بیان کیا جائے (۶) پھول (۷) بیچنے والے کی (۸) عام فائدے کو خصوصی فائدے پر ترجیح دیجاتی ہے (۹) عام نقصان کا نسبت خاص شخص کے نقصان کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے (۱۰) پھل۔

ہے مگر چونکہ پچاس کا نقصان ہے اور فروخت نہ کرنے میں ان پچاس کی مصلحت تھی اس لئے یہاں مصلحت خاص کی کچھ پرواہ نہیں کی گئی اور پھر اس تجویز کو کوئی خلاف عقل نہیں کہتا۔ پس اسی طرح یہ جو حکم ہوا کہ بہار قبل پھلنے کے نہ بیچو، اگر فرضاً اس میں کسی ایک کا نقصان بھی ہو تو عام مضرت کا تو انسداد (۱) ہو گیا اور اول تو مضرت خاص بھی یقینی نہیں بلکہ پھل آنے کے بعد زیادہ دام ملنے کی امید ہے اور اگر کوئی کہے کہ دس برس سے تو مجھ کو نقصان کا تجربہ ہو رہا ہے تو خیر اخیر بات یہی ہے کہ بہت سے بہت ایک ہی کا تو نقصان ہوا لیکن اور خریداروں کو تو بچا لیا کہ اگر پھل کم آتا تو ان کا کتنا نقصان ہوتا تو اب ایک کی مصلحت کو دیکھا جائے یا پچاس کی مصلحت کو۔

بیعِ معدوم عقلاً جائز نہیں

اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو خود صورت بیع اس کو ناجائز بتلا رہی ہے کیونکہ معدوم (۲) کی بیع خود عقلاً ناجائز ہے۔ خدا جانے ان مواقع پر عقل کہاں چلی جاتی ہے اور اگر بیع کو بدون وجود مبیع (۳) کے جائز رکھتے ہیں تو پھل آنے کی مدت تک اکل کو بھی بلا وجود مأکول کے جائز رکھیں اور یوں ہی بیٹھے ہوئے منہ چلایا کریں اور نور سے پیٹ بھر لیا کریں۔ جو شخص بغیر مأکول کے فعلِ اکل واقع (۴) کر کے دکھلا دے گا میں اس کو بیع بلا مبیع کی اجازت دے دوں گا۔ غرض عقل بھی اس کو حرام ہی

(۱) عام نقصان سے بچ گئے (۲) جو چیز موجود نہ ہو اس کا بیچنا ناجائز ہے (۳) اگر قابل فروخت چیز کے بغیر فروختگی کو اگر جائز قرار دیا جائے تو ایسا ہے کہ کھانے کی چیز موجود نہ ہو اور کہا جائے کہ کھاؤ تو خالی منہ چلانے سے پیٹ تھوڑی بھر جائے گا پیٹ بھرنے کیلئے شئی کا وجود ضروری ہے اسی طرح فروختگی کیلئے مبیع کا وجود ضروری ہے (۴) کھانے والی کسی چیز کے وجود کے بغیر کھا کر دکھائے۔

کہتی ہے تو اگر کوئی مصلحت بھی نہ ہو، تب بھی یہ واجب الاحتراز ہے کیونکہ محرماتِ عقلیہ سے ہے۔

اشکال کا جواب

اب ایک عذرِ بارد (۱) یہ ہے کہ صاحب اس مدت تک کون انتظار کرے کیونکہ اگر بڑھنے تک انتظار کریں تو پھر باغوں کی خرید ہی ختم ہوجائے گی چنانچہ خریدار اس قدر نہیں ٹھہرتے۔ اس کا جواب میں صرف یہ دیتا ہوں اگر گورنمنٹ کا یہی قانون ہوجائے جواب شریعت کا ہے تو اس وقت کیا کروگے اور اگر اس پر بھی سمجھ میں نہ آئے تو میں یہ پڑھوں گا "فبأی حدیث بعده یؤمنون" (۲) (اب اس کے بعد کونسی بات پر ایمان لاؤ گے) تو گویا خدا کے حکم کی وہ وقعت بھی نہیں جو گورنمنٹ کے حکم کی ہے صاحبو! صرف دنیا ہی کمانا تو مقصود نہیں۔

احکامِ شرعیہ کی بے وقعتی

دنیا کماؤ مگر خدا کو راضی رکھ کر اور اگر اس کی فکر نہیں ہے تو پھر حکام کو راضی رکھنے کی بھی فکر چھوڑ دو اور ڈکیتی بھی شروع کردو۔ افسوس! حکام کی ناراضی کی تو اتنی فکر اور خدا کی ناراضی کی پرواہ بھی نہ ہو، کیا خدا تعالیٰ حاکم نہیں ہے؟ ان مضامین کو سن کر بعض لوگ کہتے ہیں کہ شریعت نے آمدنی کے بہت سے صیغے (۳) بند کردیئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ کے قوانین بھی معقول ہیں یا نہیں، ظاہر ہے کہ ان کو تو معقول ہی کہو گے تو ان ہی قوانین میں ایک قانون یہ بھی ہے کہ ڈکیتی ناجائز ہے، دیکھئے کتنا بڑا صیغہ (۴) تھا آمدنی کا اور اس کو حرام کردیا، اگر کہئے کہ اس سے مصلحت عام میں خلل ہوتا

(۱) ایک معمولی عذر یہ ہوسکتا تھا (۲) سورۃ المرسلت: ۵۰ (۳) ذرائع (۴) آمدنی کا کتنا بڑا ذریعہ تھا۔

تھا اس لئے اس کو جرم قرار دے دیا تو میں کہتا ہوں کہ اسی طرح ممنوعات شرعیہ کے ارتکاب سے بھی مصلحتِ عام میں خلل ہوتا ہے جس کا کسی قدر اوپر بیان بھی کیا گیا ہے

صاحبو! اصل بات یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی قلب میں وقعت نہیں ورنہ اگر وقعت ہوتو خود بخود مصلحتیں سمجھ میں آنے لگیں پس مصالح احکام واسرار الٰہیہ کو اگر دریافت کرنا چاہتے ہوتو ان کی وقعت دل میں رکھواور ساتھ ساتھ عمل بھی شروع کرواور عمل میں خلوص پیدا کرو۔اس کا اثر یہ ہوگا کہ حسبِ استعداد خود بخود اسرار (۱) منکشف ہوں گے۔

حکمِ خدا ہونا ہی عمل کے لئے کافی ہے

اوراگر نہ بھی منکشف ہوں تو یہ تو معلوم ہے کہ خدا کا حکم ہے، وجوب عمل کے لئے یہی کافی ہے۔دیکھئے اگر ہم نوکر سے کہیں کہ یہ چار پائی فلاں جگہ سے اٹھا کر فلاں جگہ رکھدو تو اس کو مصلحت دریافت کرنے کی اجازت نہیں اور اگر وہ پوچھے بھی کہ حضور وہاں آدمی ہی کہاں ہے جس کے لئے چار پائی بھیجی جاتی ہے؟ تو کہیں گے کہ احمق اول تو تو مصلحت پوچھنے والا کون ہوتا ہے؟ پھر کیا مصلحت اس میں منحصر ہے؟ کیا چار پائی بھیجنا اسی لئے ہوتا ہے کہ وہاں آدمی ہوں بلکہ کبھی یہاں کی جگہ کا خالی کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔تو کیا خدا تعالیٰ کو اتنے جواب کا بھی استحقاق نہیں؟ اور سمجھو! کہ خدا کے علم کے ساتھ آپ کے علم کو اتنی بھی نسبت نہیں جو بچے کے علم کو آپ کے علم کے ساتھ ہے، کیونکہ ایک نسبت متناہی کی متناہی (۲) کے ساتھ ہے دوسرے متناہی کی غیر

---

(۱) خود بخود احکام کی حکمتیں سمجھ میں آنا شروع ہوجائیں گی (۲) جب بچے کے علم کو آپ کے علم سے کچھ بھی مناسبت نہیں جبکہ آپ کا علم بھی محدود اور بچے کا بھی محدود تو اللہ جس کا علم غیر محدود ہے اس کے علم کے ساتھ آپ کے محدود علم کو کیا نسبت ہوسکتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

متناہی کے ساتھ، اور اس پر بھی باوجود یکہ بچہ نشتر سے ڈرتا ہے اور نشتر کو اپنے لئے تجویز نہیں کرتا لیکن آپ اس کی اس تجویز کی ذرا پرواہ نہیں کرتے اور ضرورت کے وقت اس کے نشتر لگا دیتے ہیں صرف اسی لئے کہ اس کے علم کو آپ کے علم سے کوئی نسبت نہیں۔ پس اسی طرح تمہارا علم خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے تو پھر وہ تمہاری تجویزوں کی کیوں پرواہ کریں؟ اسی کو فرماتے ہیں "عسی ان تکرهوا شيئًا وهو خير لكم" یہ مثال تو ہے حکم تشریعی کی۔

بیمار ہونے کے فوائد

اب احکام تکوینیہ کی مثال لیجئے کہ بعض لوگ ہمیشہ بیمار رہتے ہیں اور اس کی شکایت کرتے ہیں مگر اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں کبھی تو اجر ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بیماری سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اس بیماری سے اکثر اخلاق درست ہو جاتے ہیں، عجز وانکسار وپستی ونیستی یہ سب بیماری کے اندر پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح امنگیں قطع ہو جاتی ہیں۔ تو ایسی حالت کا رہنا جس میں یہ مصالح ہوں واقع میں بہت بڑی رحمت ہے۔ امنگوں کے قطع کرنے کا مطلوب ہونا ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے "کن فی الدنیا کانك غریب او عابری سبیل" (دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو کہ تم مسافر ہو بلکہ اس طرح کہ راستہ طے کر رہے ہو) دوسرے ممکن ہے کہ تندرستی میں کچھ گناہ ہو جاتے بیماری میں اس سے بچ گیا جیسا حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچے کو قتل کر دیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت غصہ آیا تھا آخر حضرت خضر علیہ السلام نے اس میں یہی حکمت بیان فرمائی

کہ ’’اما الغلام فکان ابواہ مومنین فخشینا ان یرھقھما طغیانا و کفرا‘‘ (۱) (وہ لڑکا جو تھا تو اس کے ماں باپ مسلمان تھے تو ہم اسی بات سے ڈرے کہ کہیں یہ لڑکا اپنے ماں باپ کو کفر اور سرکشی میں مبتلا نہ کردے) تو سب کے حق میں یہی رحمت ہوا کہ وہ مر گیا، اس کے لئے تو اس واسطے کہ بچپن میں مرا۔ بقول اکثر علماء ناجی (۲) ہوا اور ماں باپ کے لئے اس واسطے کہ اگر وہ زندہ رہتا اور کفر کرتا تو ان پر بھی اثر پڑتا وہ بھی بچے۔ مولانا رحمہ اللہ نے اس کو فرمایا ہے

آں پسر را کش خضر ببرید حلق سرِّ آں را در نیابد ہیچ خلق

(اس لڑکے کو حضرت خضر علیہ السلام نے مار ڈالا اور اس کا گلا کاٹ دیا۔ اس کے بھید کو مخلوق نہیں پہنچ سکتی)

پیدائشی اندھا بہرا ہونے میں حکمت

اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی بہرا اپنے بہرے پن پر افسوس کرے اور یہ تمنا کرے کہ مجھ میں سننے کی قوت ہوتی تو کیا اچھا ہوتا لیکن اس کو کیا خبر ہے کہ اس وقت کیا حالت ہوتی ممکن ہے کہ وہ گانا بجانا سننے میں مشغول ہو جاتا غیبت سنا کرتا تو اس کے لئے کانوں کا نہ ہونا ہی خیر ہو گیا۔ علیٰ ہذا آنکھوں کی بیماری کہ اس میں بھی ممکن ہے کہ آنکھیں ہونے کی صورت میں یہ بہت زیادہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتا۔ شیخ نے خوب فرمایا ہے

آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند او مصلحتِ تو بہتر داند

(جس ذات نے تجھ کو مالدار نہیں بنایا ہے وہ تیری مصلحت کو تجھ سے زیادہ

(۱) سورۃ الکہف: ۸۰ (۲) بچپن میں مرنے کی وجہ سے دوزخ کے عذاب سے نجات پا گیا۔

جانتی ہے)علیٰ ہذا ہر چیز میں اسی قسم کی مصالح ہیں۔پس ضروری ہے کہ یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ حکیم ہیں اور بڑے رحیم بھی ہیں اس لئے وہ جو کچھ مناسب ہوگا وہی کریں گے۔

بزرگوں کی دعا کا فائدہ

حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا اس کو یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک روز جو سویا تو اس کو احتلام ہوگیا فوراً اٹھ کر غسل کیا اور سویا تو پھر احتلام ہوا۔غرض ایک شب میں ستر بار احتلام ہوا اور ہر بار میں ایک نئی اجنبیہ عورت کو دیکھتا تھا، اس کو خیال ہوا کہ شیطان کے اس قدر تسلط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید میں مردود ہوگیا حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نہایت مغموم حاضر ہوا، آپ نے تبسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ خدا کا شکر کرو مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ تمہاری قسمت میں ستر اجنبیہ عورتوں سے زنا کرنا لکھا ہے میں نے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اس کو اس سے بچایئے خدا تعالیٰ نے میری دعا کو قبول فرمایا اور اس کو بیداری سے خواب میں منتقل فرمادیا کہ تقدیر ہی پوری ہوگئی اور تم گناہ سے محفوظ رہے۔ اور یہاں تقدیر کے اس طرح بدلنے کے متعلق ایک مسئلہ بھی ہے مگر مجلس عام میں اس کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں کہ شاید سمجھ (۱) میں نہ آئے۔تو دیکھئے واقع میں تو یہ حالت رحمت تھی جو حضرت پر منکشف ہوگئی اور اس کے نزدیک عذاب تھا۔

قربِ الٰہی کے طرق

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور آکر یہ عرض کیا کہ میں بیمار ہوگیا تھا اتنی مدت تک مجھ کو حرم کی نماز نصیب نہیں ہوئی۔حضرت رحمہ اللہ نے

(۱)مختصراً حاصل اس کا یہ ہے کہ بعض واقعات کی بعض قیود لوحِ محفوظ میں نہیں ہوتیں علمِ الٰہی میں ہوتی ہیں۔پس جس کو لوحِ محفوظ منکشف ہوتی ہے اس کو وہ قید معلوم نہیں ہوتی وقوع کے وقت وہ اس کو تبدیل سمجھتا ہے۔۱۲منہ۔

اپنے خواص سے فرمایا کہ عارف ان باتوں سے مغموم نہیں ہوتا کیونکہ مقصود تو حق تعالیٰ کا قرب ہے اور جس طرح حالتِ اختیار میں حرم کی نماز قرب کا ایک طریق ہے اسی طرح قرب کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بیمار ہو جائیں اور بیماری کا اجر ملے اور بحسب حدیث اس کے ساتھ ہی نماز کا بھی وہی اجر ملے جو تندرستی کی حالت میں حاضریٔ حرم سے ملتا۔ اس کے بعد فرمایا کے بندہ کو مولیٰ پر فرمائش کرنے کا حق نہیں کہ مجھ کو فلاں طریق سے قرب عنایت ہو دونوں رستے خدا تک پہنچنے کے ہیں جس طریق سے چاہے پہنچائے بندے کو کیا حق ہے کہ ایک طریق کو تجویز کرے۔ خوب کہا ہے۔

بدُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش — کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطافست

(تجھے یہ نہ سوچنا چاہئے کہ شراب میلی ہے یا صاف، بس پی لینی چاہیے ہمارے ساقی نے جو کچھ ہم کو دیا وہی عین مصلحت ہے)

اور فرمایا۔

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مُزد مکن — کہ خواجہ خود رَوِش بندہ پروری داند

(تو فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط لگا کر عبادت مت کر۔ جو آقا ہے وہ خود اپنے غلاموں کی پرورش کے طریقے کو جانتا ہے)

اور فرمایا۔

فکر خود و رائِ خود در عالمِ رندی نیست — کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(عاشقی کے معاملہ میں اپنی فکر کرنا یا اپنی رائے پر چلنا درست نہیں ہے۔ عشق کے مذہب میں خود کو کچھ سمجھنا اور اپنی رائے پر چلنا کفر کے برابر ہے)

بس جس طرف سرکار لیجائیں بالکل خیر ہے۔

درطریقت ہرچہ پیش سالک آید خیراوست
برصراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(درویشی کے رستے میں درویش کے سامنے جو مصیبت بھی آ جائے اسی کو بہتر ہی سمجھے۔اے دل صراط مستقیم میں کوئی شخص کبھی گمراہ نہیں ہوا)

اختیاری اور غیر اختیاری افعال میں فرق

لیکن آید کہا ہے آرد نہیں کہا یعنی ایک تو آید ہوتا ہے اور وہ غیر اختیاری (۱) امور ہیں، وہ سب محمود ہیں اور ایک آرد اور وہ امور اختیاریہ (۲) ہیں ان میں بعضے مذموم بھی ہیں۔اس شعر میں اس کا ذکر نہیں اور اس سے ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا یعنی مثلاً اگر کوئی شخص کہنے لگتا ہے کہ ہم سود لیتے ہیں اور یہ بھی ہرچہ پیش آید میں داخل ہے تو اس میں بھی خدا تعالیٰ کی مصلحت ہوگی، تو اس قاعدے سے اس شبہ کا جواب ہو گیا یعنی یہ حکم خدائی افعال میں ہے تمہارے افعال میں نہیں پس ہمارے اختیاری افعال میں تو اچھے برے دونوں ہونگے اور خدا تعالیٰ کے جتنے افعال ہیں وہ سب رحمت محض ہیں، مثلاً کسی عزیز کا مر جانا یا قحط ہونا یا طاعون ہونا اور اگر کوئی کہے کہ قحط تو گناہوں سے آتا ہے علی ہذا طاعون بھی، سو رحمت کیسے ہوا؟ تو صاحبو! یہ بھی تو رحمت ہے کہ تم گناہوں سے

(۱) ایسے کام جن میں انسان کے اختیار کو دخل نہیں ہے اگر اس میں مبتلاء ہوتا ہے جیسے بیماری وغیرہ تو وہ بھی اس کیلئے بہتر ہے اور اللہ کی طرف سے ہے (۲) ایسے کام جن کے کرنے نہ کرنے کا بندے کو اختیار ہے اگر اس میں مبتلا ہوتا ہے جیسے سود لینا نہ لینا وغیرہ تو وہ اس شعر کا مصداق نہیں ہے کیونکہ ہمارے افعال میں اچھے برے سب ہیں برے افعال میں ابتلاء اس کے اپنے فعل سے ہے اس لئے وہ خیر نہیں بلکہ اس پر مواخذہ ہے۔

صاف ہوگئے۔اسی واسطے حدیث شریف میں ہے کہ "طاعون مومن کے لئے رحمت ہے" کیونکہ اس سے تطہیر ہوگی۔حدیث میں ہے کہ "ہر بیماری سے گناہ پاک ہوتے ہیں" بلکہ یہاں تک آیا ہے کہ اگر کوئی چیز رکھ کر بھول جائے تو اتنی پریشانی سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں۔غرض ہر چیز جو ہمارے اختیار سے خارج ہو وہ ہمارے لئے رحمت ہے۔

ہم اللہ کی مِلک ہیں

پھر ایک بات یہ سمجھو کہ ہم خدا کے ہیں یا اپنے ہیں، ظاہر ہے کہ ہم خدا کے ہیں اسی واسطے ارشاد ہے "ولا تقتلوا انفسکم" (۱) (مت قتل کرو اپنی جانوں کو) اگر ہم اپنے ہوتے تو ہم کو ہر تصرف اپنے نفس میں جائز ہوتا، تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی چیز میں جسطرح چاہے تصرف کرے عقل کا فتویٰ تو یہی ہے اور اسی واسطے "انا للہ" کی تعلیم فرمائی جس میں لامِ تملیک (۲) ہے جس کا مقتضایہ ہے اگر بالفرض ان احکام میں کوئی مصلحت بھی نہ ہوتی تب بھی ہم کو اس پر اعتراض نہ ہونا چاہئے تھا چہ جائیکہ ہر مصیبت میں نفع اور مصلحت بھی ہے۔

سالکین کو پیش آمدہ مصیبت کا علاج

اور یہاں تک مصائب ظاہرہ کا ذکر تھا ان کے علاوہ ایک اور باطنی مصیبت ہے جو بعض ان خالص لوگوں کو پیش آتی ہے جو ذکر و شغل کرتے ہیں۔وہ یہ ہے کہ مجاہدہ کرتے ہیں مگر کوئی نفع ان کے خیال میں محسوس نہیں ہوتا مثلاً میلان الی الطاعۃ (۳) نہیں ہوتا۔ذوق شوق نہیں ہوتا۔علیٰ ہذا جس سے وہ اس قدر تنگ آتے

---

(۱) سورۃ النساء:۲۹ (۲) لام ملکیت کو ظاہر کرتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے (۳) نیکی کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

ہیں کہ اگر بے اختیاری کی حالت غالب ہوتی ہے تو اس قسم کے الفاظ زبان سے نکل جاتے ہیں۔

خستگان را چو طلب باشد وقوت نہ بود گر تو بیداد کنی شرط مروت نہ بود

(کمزور لوگوں میں جب کسی چیز کا شوق تو ہوتا ہے مگر قوت نہ ہو تو ان پر زبردستی کرنی مروت کے خلاف ہے)

لیکن اختیار سے ایسا کہنا جائز نہیں اس آیت شریف سے اس کا بھی علاج سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس وقت یہ سمجھنا چاہئے کہ ممکن ہے جس حالت کو تم مفید سمجھے وہ مفید نہ ہو حالاً یا مآلاً (۱)۔ اور بالعکس اسی کو فرماتے ہیں۔

چونکہ قبضی آیدت اے راہ رو آں صلاح تست آیس دل مشو

چونکہ قبض آمد تو دروی بسط بیں تازہ باش وچیں میفگن بر جبیں

(اے راستہ کے چلنے والے جب تجھے تنگی پیش آئے اس میں تیرے لئے بہتری ہے۔ ناامید مت ہو جب تجھے تنگی ہو تو اسی میں کشادگی کو تلاش کر، خوش رہ اور پیشانی پر بل نہ آنے دے)

حالتِ قبض وبسط کا نفع نقصان

خلاصہ یہ کہ اس میں مصلحت ہوگی چنانچہ نمونے کے لئے ایک مصلحت تو میں بتلاتا ہوں نیز بعض اوقات جو بسط (۲) میں حیرانی ہو جاتی ہے اس کو بھی بتلاتا ہوں وہ نفع تو قبض (۳) میں یہ ہے کہ اس وقت اپنا ناکارہ ہونا بالکل پیش نظر ہو جاتا ہے اور بسط میں وہ ضرر یہ ہے کہ بعض اوقات عجب (۴) پیدا ہو جاتا ہے کہ اب تو ولی ہو گئے، تو اس

(۱) فی الحال یا انجام کار (۲) کشادگی (۳) تنگی (۴) خود پسندی۔

صورت میں قبض منجی (۱) ہے اور بسط مہلک ہے تو قبض کا عطا ہونا گویا ایک ایسی کیفیت کا عطا ہونا ہے جو سبب نجات ہے پس اس پر راضی ہونا چاہئے۔اسی کو فرماتے ہیں۔

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش

بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

(اے باغبان اگر تو چند روز کے لئے پھول کے پاس رہنا چاہتا ہے تو بلبل کی طرح جدائی کے کانٹوں کے ظلم پر صبر کرتے رہو)

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(اے دل اس کی زلف کی قید میں رہ کر پریشانی سے مت رو۔سمجھدار پرندہ جب پھندے میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے)

تکیہ بر تقویٰ ئ دانش در طریقت کافریست

راہ رو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

(درویشی کے راستہ میں اپنی پرہیزگاری اور سمجھ پر بھروسہ کرنا کفر ہے۔اے راستہ کے چلنے والے اگر چہ تو سو کمال بھی رکھتا ہو پھر بھی اپنے کمال پر بھروسہ نہ کرنا صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا)

باقی یہ کہ قبض کی حالت میں لذت نہیں رہتی سو لذت خود مطلوب نہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

---

(۱) حالت قبض نجات دینے والی ہے اور حالت بسط ہلاک کرنے والی ہے۔

فراق وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از وغیرِ او تمنائے

(جدائی اور ملاقات کا کچھ خیال مت کر محبوب کی خوشنودی تلاش کر وہ جس حالت میں بھی راضی ہو اسی کو پسند کر۔افسوس کا مقام ہے اگر اس کی ذات کے سوائے دوسری چیز طلب کیجائے)

استغفار کی ضرورت واہمیت

بعض کہتے ہیں کہ ذکر ومجاہدہ سے ہمارا میلان معصیت بھی دفع (۱) نہیں ہوتا اور اس کو مصیبت سمجھتے ہیں، تو خوب سمجھ لو! کہ اگر میلان کے ساتھ ہمت بھی گناہ (۲) سے بچنے کی ہو تو یہ بڑا بھاری مجاہدہ ہے اور مجاہدہ جتنا زیادہ ہوتا ہے اس میں ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے تو گویا خدا تعالیٰ کو ثواب زیادہ دینا منظور ہوتا ہے، سو یہ خدا کی رحمت ہے کہ اجر بڑھانے کے واسطے یہ داعیہ پیدا کر دیا۔غرض کام کئے جاؤ اور معصیت (۳) سے بچو اور اگر اتفاقاً معصیت بھی ہو جائے تو اس کے بھی زیادہ پیچھے نہ پڑو بلکہ اس کا علاج کر کے آئندہ کو بچو۔

جناب رسول ﷺ نے اس کا علاج استغفار کو فرمایا ہے بعض اوقات شیطان سالک (۴) پر بڑا قبضہ کر لیتا ہے کہ شرم کے مارے توبہ نہیں کرتا اور محروم رہ جاتا ہے۔سو صاحبو! گناہ سے محض مغموم ہونا کافی نہیں بلکہ استغفار کرنا چاہئے اور بعد توبہ خالصہ کے پھر اس کو قصداً (۵) یاد نہ کرے کہ بعض اوقات اس سے کیفیت مایوسی کی پیدا ہو کر

---

(۱) ذکر کرنے سے گناہ کی طرف ہمارا طبعی میلان بھی ختم نہیں ہوتا (۲) اگر گناہ کی طرف طبعی میلان ہو اور اسکے ساتھ گناہ سے بچنے کی بھی ہمت ہو جائے تو یہ عظیم مجاہدہ ہے (۳) گناہ (۴) تصوف کی راہ قطع کرنے والے پر (۵) ارادۃً یاد نہ کرے۔

آدمی معطل (۱) ہوجاتا ہے اوا گر بلا قصد یاد آئے تو پھر توبہ کرلے اور توبہ میں ہر ہر گناہ کو سوچنے اور فہرست گننے کی بھی ضرورت نہیں ۔حضور ﷺ نے صیغۂ استغفار میں خود اشارہ فرمایا ہے" اللّٰھم اغفرلی ماقدمت وما اخرت وماأسررت وما انت اعلم به منی" (اے اللہ آپ میری مغفرت فرمادیجئے اس سے جو میں نے ابتک کیا یا آئندہ کروں اور جو کچھ میں نے چھپا کر کیا اور جو کچھ آپ میرے متعلق جانتے ہیں)اس میں مجمل ومبہم عنوان کو کافی قرار دیا قربان جایئے آپ کے کہ ہم کو کس قدر مضائق (۲) سے بچالیا اور کیسی آسان راہیں بتلائی ہیں لیکن اگر کوئی کام ہی نہ کرے تو کچھ علاج ہی نہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(چمگادڑ اگر دن میں نہیں دیکھ سکتا تو اس میں آفتاب کا کیا قصور؟)

دعا کی اہمیت

یہ استغفار کا ذکر استطراداً تھا اصل مضمون یہ تھا کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج پیش آئے اس کو مصلحت سمجھے اور اس پر خدا کا شکر کرے خواہ بلائے ظاہری ہو خواہ بلائے باطنی ہو۔ یہ تھا بیان مرضِ تمنی کا، جس میں اہل سلوک بھی کم وبیش مبتلا ہیں اسی کی ممانعت اس حدیث میں ہے کہ" ایاکم واللو فان لو یفتح عمل الشیطان"، ہم نے ہزاروں مرتبہ یہ حدیث شریف پڑھی ہوگی لیکن آج جو بات اس سے سمجھ میں آئی وہ آج تک سمجھ نہ آئی تھی۔

الحمدللہ! اور ایک بڑی رحمت اس کے ساتھ یہ فرمائی ہے کہ طبیعت انسانی کا

(۱) بے کار ہوجاتا ہے (۲) کتنی ہی مشکلوں سے بچالیا۔

بھی لحاظ فرمایا یعنی تمنا خود بخود طبیعت سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کی تعدیل فرمادی ہے وہ یہ کہ دعا کو مشروع فرمادیا کہ اگر کسی چیز کی تمنا پیدا ہو تو بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کو رائے دو وہ ارمان اس طرح نکالو کہ دعا کرلیا کرو کہ تمنا سے وہ بہتر ہے۔ کیونکہ تمنا کے معنی تو خدا تعالیٰ کو رائے دینا ہے کہ اس طرح کرنا نامناسب تھا بخلاف دعا کے کہ وہ عرض ہے جناب باری میں اور ساتھ ہی اس پر رضا ہے کہ اگر یہ اس طرح نہ ہوگا تو میں اسی کو مصلحت سمجھوں گا۔ جو حاصل ہے مضمون ''عسی ان تکرھوا'' الآیۃ کا۔

دعا اور تمنا میں فرق

پس دعا غبار نکالنے میں تو تمنا کے ہم پلہ ہے اور عرض میں اس کے خلاف۔ مثلاً جب بیمار ہو تو صحت کی دعا کرو۔ اسی طرح صبر کی دعا کرو تو اس سے غبار تو نکل جائے گا جو بات پسند آئے کہہ لے اور حسرت نہیں ہوگی جیسے تمنا میں ہوتی ہے کیونکہ حسرت مافات (۱) پر ہوتی ہے اور مافات (۲) کی دعا جائز نہیں جیسے کوئی کہے کہ مجھے نبی کردے کہ اس کا انتفاء اور فوت (۳) یقینی ہے تو اثر میں دعا تمنا سے اچھی ہوئی اور حقیقت کے اعتبار سے اس سے یوں متغایر (۴) ہے کہ وہاں مشیت میں دخل دینا ہے اور یہاں چونکہ مشیت (۵) کا علم نہیں لہذا اسکے ساتھ مقابلہ نہیں ہے بلکہ استدعاء اور ساتھ ہی مشیت (۶) پر رضا۔ اور اس دونوں کا فرق بھی معلوم ہوگیا اور اگر حسرت کے مضمونِ مذکور پر یہ شبہ ہو کہ ہم فائت (۷) پر تمنا نہ کریں گے بلکہ مستقبل پر تمنا کریں تو اس میں حسرت کیا ہوگی

---

(۱) افسوس اس بات پر ہوتا ہے جو چیز انسان سے فوت ہوجائے (۲) جو چیز انسان کو نہ مل سکتی ہو (۳) اس کا نہ ملنا یقینی ہے (۴) اس میں یہ فرق ہے (۵) اللہ کی چاہت (۶) اللہ کی چاہت پر رضامندی کا اظہار ہے (۷) فوت شدہ پر تمنا نہیں کریں گے۔

تو میں کہتا ہوں کہ پھر دعا ہی کیوں نہ کرو کہ ایہام رائے (۱) سے بھی محفوظ رہو اور دعا کے مفید و مشروع ہونے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ واقعات کا مخفی رہنا اور کشف نہ ہونا بہتر ہے کیونکہ پھر کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ خلاف کشف سوال کرنے سے ضرور اندر سے جی کھٹکتا ہے۔ سبحان اللہ! کیا رحمت ہے کہ اپنی ہم کلامی میں لذت بخشنے کے لئے واقعات کو مخفی رکھا پھر چاہے ہو یا نہ ہو لیکن برکاتِ دعا تو حاصل ہوئے۔

دعا کے قبول نہ ہونے کی صورت میں کیا کرے

رہی یہ بات کہ اگر دعا کی اور مقصود حاصل نہ ہو تو پھر کیا کرے یا جب تک حاصل نہ ہو اس وقت تک کیا ہی کرے؟ تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ دعا تو نہ چھوڑے لیکن جب تک وقوع نہ ہو صبر کرے، بس صبر اور دعا دونوں رکھے اور یہ دعا بعد ظہور عدم اجابت رضا بالقضا (۲) کے بھی منافی نہیں کیونکہ وہ عدم اجابت جس وقت تک ظاہر ہوا ہے اس وقت تک کے لئے اسی عدم استجابت پر راضی (۳) رہے اور جن اوقات کے متعلق عدم استجابت ثابت نہیں ہوا ان کے لئے پھر دعا کرتا رہے تو دونوں سلسلے برابر جاری رہیں۔ غرض دعا کو بھی مشروع فرمایا جیسا دوسرے نصوص میں ہے اور تمنا کو منع فرمایا جیسا اس آیت میں ہے" عسی ان تحبوا شیئا وھو شرلکم "خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے جتنے احکام ہیں تکوینی یا تشریعی ان کے خلاف تمنا نہ کرے بلکہ ان پر صبر کرے اور جو دل میں کوئی تمنا پیدا ہو بجائے اس کے دعا کرتا رہے۔

---

(۱) اللہ کو رائے دینے کے شبہ سے بھی بچ جائے گا (۲) صبر کے ساتھ دعا کرتے رہنا رضا بالقضاء کے خلاف نہیں چاہے دعا کا قبول نہ ہونا ظاہر بھی ہو جائے (۳) قبول نہ ہونے پر خوش رہے۔

مصیبت کے وقت کا دستور العمل

میں نے اس وقت مضمون کو اس لئے زیادہ بیان کیا کہ یہاں ایک واقعہ ہوگیا ہے جس سے اکثر کے قلب پر اثر ہوگا اور اثر ہونا تو بعید نہیں۔ واقعہ میں بھی مثل نشتر (۱) کے اثر ہوتا ہے دیکھو اگر نشتر لگاتے ہیں تو کھال میں کتنا اثر ہوتا ہے لیکن ہم کو اعتراض کا کوئی حق نہیں کیونکہ ہم کوئی رشتہ دار یا سر رشتہ دار نہیں ہیں کہ حکمت کی تفتیش کریں۔ باقی حکمتیں ہیں ضرور، لیکن مصیبت ختم ہونے کا طریقہ یہ نہیں کہ ان حکمتوں کی تفتیش کی جائے بلکہ مصیبت کے ختم ہونے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کو سوچے نہیں اور تذکرہ نہ کرے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کئی کئی مہینے کے بعد بھی مصیبت زدہ کے پاس آکر برابر رنج وصدمہ کا تذکرہ کر کے اس کو تازہ کیا کرتے ہیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ تین دن کے بعد تعزیت نہ کرے کیونکہ وہ واقع میں تعزیت ہی نہیں۔ کیونکہ تعزیت کی حقیقت ہے تسلی دینا اور اس میں بجائے تسلی کے دونی آگ بھڑکتی ہے۔

طریقۂ تعزیت

بس اس کا طریقہ تو یہی ہے کہ پھر ایسے قصوں کو یعنی ان واقعات کو قصداً یاد نہ کرے۔ البتہ مردے کو نفع پہنچانے کے لیے یاد کرے اور جو حقوق اس کے ذمہ ہیں وہ ادا کرے اس سے اس کو نفع ہوگا اور اپنے سکون کے لئے ذکر اللہ میں مشغول رہے کہ ذکر اللہ سے سکون ہوگا۔ نیز متممّاتِ راحت رسانی اموات (۲) سے یہ ہے کہ اس

(۱) جیسے نشتر لگنے سے تکلیف ہونا طبعی بات ہے ایسے ہی کسی کی موت یا مصیبت سے پریشان ہونا بھی طبعی بات ہے (۲) مردہ کو راحت و آرام پہنچانے کی تکمیل کرنے والی ایک بات یہ ہے۔ منشی خلیل الرحمٰن صاحب کاندھلوی تحصیلدار بھوپال کی وفات ہوئی تھی۔ ۱۲ منہ۔

کے اموال میں گڑبڑ نہ کرو کیونکہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے ”اعمال الاحیاء تعرض علی الاموات“ (۱) تو اس کے متعلق خلاف شرع کام کرنے سے اس کو اذیّت ہوگی۔ اگر کوئی کہے کہ اس کی اذیت سے مجھ کو کیا، تو میں کہوں گا کہ عذاب کی تم کو بھی تو تکلیف ہوگی۔ نیز اگر عذاب بھی نہ ہوتا تب بھی خدا کی مرضی کی تو پرواہ کرنا ضرور تھا غرض اس کا نفع اس میں ہے کہ اس طور سے اس کو یاد کرو اور اپنے سکون کے لئے ایک تدبیر یہ ہے کہ کسی کام میں لگے رہو کیونکہ بے کاری میں یہ سب قصّے یاد آتے ہیں اگر دین کا کام نہ ہو تو دنیا ہی کے کام میں لگ جاؤ مگر مباح (۲) کام ہو۔ غرض غم کو ہلکا کرنا چاہیے ورنہ قضائے خداوندی سے تنگی ہوتی ہے۔ پس اسی کے علاج کے لئے ارشاد ہے ”عسی ان تکرھوا شیئا وھوخیرلکم وعسی ان تحبوا شیئا وھوشرلکم“ (یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی ہو) اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

اب میں ختم کرتا ہوں اپنے (اور ناشر محمد عبدالمنان کے) لئے بھی دعاءِ توفیق کیجئے اور اموات کے لئے بھی دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ مغفرت کرے (آمین برحمتك یاارحم الراحمین)

تمت بالخیر

---

(۱) زندوں کے اعمال مردوں پر پیش کیے جاتے ہیں (۲) جائز کام ہو۔ محشی اس کی اولاد اور اس وعظ کی طباعت میں تمام کوشش کرنے والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے۔

خلیل احمد تھانوی۔ ۹ ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ

قطع التمنی

(احکام الٰہی میں رائے زنی سے احتراز)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	تمہید	۳
۲	فوائد آخرت کی ناقدری	۴
۳	ناتمام شاگردی	۵
۴	احتیاج کا اظہار	۶
۵	علماء کی صحبت کا فائدہ	۸
۶	تلاوت قرآن کا فائدہ	۱۰
۷	قرآن کے معانی میں غور کی ضرورت	۱۰
۸	ایک غلطی کی اصلاح	۱۱
۹	احکام کی اقسام	۱۲
۱۰	روشن خیالی کی حقیقت	۱۳
۱۱	جمہوریت کی حقیقت	۱۵
۱۲	شریعت میں سلطنت شخصی معتبر ہے	۱۵
۱۳	چوتھی صدی کے بعد اجتہاد	۱۷
۱۴	احکام دین میں لوگوں کی رائے زنی	۱۹
۱۵	قربانی میں مقصود خون بہانا ہے	۲۰
۱۶	ربٰو کی غلط تشریح	۲۱
۱۷	احکام دین اور اسلام کے بارے میں بے ہودہ آراء	۲۱
۱۸	اللہ کی شان میں گستاخی	۲۲
۱۹	احمقوں کی بستی	۲۴

۲۰	اللہ کی بے نیازی کا مطلب	۲۶
۲۱	اہل اللہ کی معمولی لغزش پر گرفت	۲۷
۲۲	مقام ادب میں احتیاط لازم ہے	۲۷
۲۳	تحقیق مرجع ضمیر	۲۸
۲۴	احکام شرعیہ میں عام مصلحت کا لحاظ	۲۹
۲۵	بیع معدوم عقلا جائز نہیں	۳۰
۲۶	اشکال کا جواب	۳۱
۲۷	احکام شرعیہ کی بے وقعتی	۳۱
۲۸	حکم خدا ہونا ہی عمل کیلئے کافی ہے	۳۲
۲۹	بیمار ہونے کے فوائد	۳۳
۳۰	پیدائشی اندھا بہرا ہونے میں حکمت	۳۴
۳۱	بزرگوں کی دعاء کا فائدہ	۳۵
۳۲	قرب الٰہی کے طرق	۳۵
۳۳	اختیاری اور غیر اختیاری افعال میں فرق	۳۷
۳۴	ہم اللہ کی مِلک ہیں	۳۸
۳۵	سالکین کو پیش آمدہ مصیبت کا علاج	۳۸
۳۶	حالت قبض وبسط کا نفع ونقصان	۳۹
۳۷	استغفار کی ضرورت واہمیت	۴۱
۳۸	دعا کی اہمیت	۴۲
۳۹	دعا اور تمنا میں فرق	۴۳
۴۰	دعا کے قبول نہ ہونے کی صورت میں کیا کرے	۴۴
۴۱	مصیبت کے وقت دستور العمل	۴۵
۴۲	طریقہ تعزیت	۴۵

وعظ

قطع التمنّی

(احکام الٰہی میں رائے زنی سے احتراز)

یہ وعظ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے قصبہ کاندھلہ میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے گھر میں ۱۰ جمادی الاولی ۱۳۳۰ھ کو 3 گھنٹے تک کھڑے ہوکر بیان فرمایا۔ مولانا سعید احمد صاحب نے نے اس کو قلم بند فرمایا اور سامعین کی تعداد تقریباً 60 تھی مجمع میں عورتیں بھی تھیں۔